وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے بڑا برکت والا

تفسیر

ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور الباری اعظمی

ناشر

بیت الحکمت دیوبند (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھٰذا کتٰبٌ انزلنٰہ مبٰرکٌ

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ

ترجمہ

ظہور الباری اعظمی

پارہ اول کا جزء اول

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (یو۔پی)

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

نذر

عالم اسلام کی شہرہ آفاق درسگاہ "دارالعلوم دیوبند" کی بارگاہ میں جس کے دامان تربیت نے ایک تہی دامن کو علم کی رفعتوں کی جانب نظر اٹھانے کی تاب بخشی۔ صحیح فکر کی آبیاری اور ذہنوں کے ساغر کو کھنگھالنے کا یہ میخانہ خدا کرے کہ ابدیت نشان ہو، کہ ے عالم نہ شود ویراں تا ایں میکدہ آباد است ۔ ناچیز، ظہور الباری ۔

فہرست

تفسیر ابن جریر طبری جزء اول

مختصر سوانح علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ

نام وغیرہ

آپ کا نام محمد بن جریر طبری ہے اور کنیت ابو جعفر۔ ۲۲۴ھ میں طبرستان کے شہر آمد میں پیدا ہوئے اور ۲۶ شوال ۳۱۰ھ شنبہ کے دن بغداد میں وفات ہوئی۔ دوسرے دن وہیں اپنے گھر میں دفن کئے گئے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ میں نے مصر میں ایک قبر کے بالیں پر ایک کتبہ دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ محمد بن جریر طبری کی قبر ہے اور وہاں عوام میں بھی یہی مشہور ہے لیکن یہ شہرت بے بنیاد ہے۔ صحیح یہی ہے کہ آپ کی قبر بغداد میں ہے۔

حصول علم کیلئے جد وجہد

حصول علم کے لئے آپ نے مصر، شام اور عراق کا سفر کیا اور پھر بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ کے اساتذہ اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ قرآن مجید کا علم آپ نے عباس بن ولید اور سلیمان بن عبدالرحمن طلحی رحمۃ اللہ علیہما حاصل کیا اور حدیث محمد بن عبدالملک بن ابی شوارب، اسحاق بن اسرائیل، اسماعیل بن موسیٰ، ابو ہمام سکونی، ابو کریب اور بہت سے دوسرے ائمہ رحمہم اللہ سے سنی۔ بغداد میں جب آپ نے سکونت اختیار کرلی اور ساتھ ہی حلقۂ درس قائم کیا تو دور دور سے طلبہ کا ہجوم آپ کے پاس جمع ہونے لگا۔ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں ابو شعیب حرانی، ابو عمر بن حمدان نیساپوری اور ابو الحسن علی بن غیلان حرانی رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علوم کی جو جامعیت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی تھی اس میں آپ کے دور کا کوئی عالم بھی آپ کے ہم پلہ نہیں تھا۔ کتاب اللہ پر آپ کی نظر عارفانہ تھی اور اس کے احکام ومعانی پر پوری بصیرت سے کلام کیا کرتے تھے۔ حدیث پر بھی بڑی گہری نظر تھی۔ روایات کے صحت وسقم اور ناسخ ومنسوخ کو خوب سمجھتے تھے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اور تابعین کے اقوال، احکام شریعت اور حلال وحرام کے تمام مسائل آپ کے سامنے آئینہ کی طرح روشن تھے۔

تصانیف

آپ نے امم وملوک کی تاریخ پر ایک مشہور کتاب لکھی اور آپ کی یہ تفسیر اپنے طرز میں بے نظیر شمار کی جاتی ہے۔ ایک کتاب آپ کی "تہذیب الآثار" ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس جیسی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ لیکن بدقسمتی سے اسے آپ پوری نہ کر سکے تھے۔ اصول فقہ اور جزئیات فقہ میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ خطیب نے لکھا ہے کہ میں نے علی بن عبداللہ بن عبدالغفار لغوی اور معروف سمسانی سے سنا کہ ابن جریر رحمۃ اللہ نے چالیس سال تک تالیف وتصنیف کی ہے اور اس چالیس سالہ دور تالیف میں روزانہ اوسطاً چالیس صفحے لکھے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ شیخ ابو حامد اسفرائینی رحمۃ اللہ کا یہ قول میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص چین جیسے دور دراز ملک کا سفر صرف اس مقصد سے کرے کہ تفسیر ابن جریر اسے مل جائے تو اتنی محنت ومشقت اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی زیادہ نہیں ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے بعض تلامذہ نے بلوغ کے بعد سے آپ کی وفات تک کے درمیانی وقفے میں آپکی تصنیفات کے صفحات کی تقسیم کی تو چودہ صفحہ روزانہ کا اوسط نکلا۔ ایک مرتبہ ابن جریرؒ نے اپنے شاگردوں سے اپنی تفسیر قرآن کا ذکر کیا جو اس وقت زیر تصنیف تھی۔ شاگردوں نے پوچھا کہ اس کی ضخامت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تیس ہزار صفحات۔ شاگرد کہنے لگے پھر تو عمر ختم ہو جائے گی اور آپ کی تفسیر کوئی پوری نہ پڑھ پائے گا۔ چنانچہ آپ نے اس کا اختصار تین ہزار صفحات میں کرکے لکھا۔ آپ کی تاریخ بھی جو آدم علیہم السلام کے زمانہ سے مصنف کے عہد تک کے مشہور واقعات پر پھیلی ہوئی ہے، اتنی ہی ضخامت کی ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں نے ابو بکر بن بالویہ رحمۃ اللہ سے سنا، آپ نے بیان کیا کہ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ابن جریر رحمۃ اللہ کی تفسیر ان سے سنکر لکھی ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے عرض کی جی ہاں انھوں نے مجھے املا کرائی تھی۔ انھوں نے پوچھا، پوری کتاب؟

میں نے عرض کی جی ہاں، پوری کتاب انھوں نے لکھوائی تھی۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ کتنے سال میں تم نے اسے مکمل کر لیا تھا؟ میں نے کہا کہ سات سال میں! ..... ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے مجھ سے تفسیر عاریۃً لی اور جب کئی سال بعد واپس کرنے لگے تو فرمایا کہ میں نے یہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ روئے زمین پر محمد بن جریر طبری سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہوگا۔ ابو علی طوماری رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ رمضان میں ابوبکر بن مجاہد تراویح کے لئے تشریف لاتے تو میں انھیں راستے میں قندیل دکھایا کرتا تھا۔ آخری عشرہ کی ایک رات میں آپ اپنے گھر سے نکلے اور اپنی مسجد میں آنے کے بجائے محمد بن جریر رحمہ اللہ کی مسجد کے پاس جاکے کھڑے ہوگئے۔ ابن جریر رحمہ اللہ اس وقت سورہ رحمان کی تلاوت کر رہے تھے۔ آپ بہت دیر تک ان کی قرارت سنتے رہے۔ پھر جب واپس آنے لگے تو میں نے عرض کی، یا استاذ! آج آپ کے نمازیوں کو آپ کا بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ آپ ان کی قرارت سننے کیوں تشریف لائے تھے؟ انھوں نے فرمایا، ابن علی یہ نہ کہو، میں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے (اس زمانہ میں) ان سے بہتر قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا کوئی پیدا کیا ہے۔

ابن جریر کا استغناء

خلیفہ مکتفی باللہ نے حسن بن عباس سے ایک مرتبہ کہا کہ میں ایک ایسا وقف کرنا چاہتا ہوں جس کی صحت پر تمام علماء کے اقوال متفق ہوں اور کسی کا کوئی اختلاف نہ ہو۔ انھوں نے خلیفہ سے فرمایا کہ پھر آپ کو ابن جریر رحمہ اللہ کی خدمت میں جانا چاہیئے۔ آخر ابن جریرؒ نے خلیفہ کے لئے ایک تحریر لکھدی۔ بعد میں خلیفہ نے آپ کیلئے سالانہ وظیفہ مقرر کرنا چاہا۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ آپ سے کہا گیا کہ یا آپ وظیفہ منظور کریں یا پھر کوئی ضرورت پوری کروالیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں ایک ضرورت ہے۔ امیر المومنین سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ وقف سے پہلے اس وقف کی شرط پوری کریں۔ یعنی ان کا ابتدائی قدیم یہ ہو کہ خاص شاہی کمرہ جو مسجد میں ہے اس میں عام آنے جانے کی جمعہ کے دن اجازت ہو۔ امیر المومنین نے فوراً اس بات کو مان لیا۔ ... ابن جریر رحمہ اللہ کے شاگرد ابو محمد فرغانی نے بیان کیا کہ حسن بن عباس وزیر نے آپ کی خدمت میں یہ درخواست بھجوائی کہ فقہ پر کوئی مختصر کتاب لکھیں۔ چنانچہ آپ نے "کتاب الخفیف" لکھ کر وزیر کے پاس بھجوائی۔ وزیر نے ایک ہزار دینار آپ کو نذر کرنے چاہے۔ لیکن آپ نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ سے کہا گیا کہ اسے قبول فرمالیں اور پھر صدقہ کر دیں۔ لیکن آپ اس پر بھی تیار نہیں ہوئے۔

ابن جریر اور فقہ

آپ کا علم، تقوی اور زہد و قناعت ہر طبقہ کے علماء کے یہاں مسلم ہے۔ آپ مسائل فقہ میں کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ خود مجتہد تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ کی طرح آپ کو بھی اجتہاد کا درجہ حاصل تھا اور جو لوگ آپ کے مذہب کی کسی زمانے میں تقلید کرتے تھے انھیں "جریریہ" کہا جاتا تھا۔ تاریخ، رجال، اصول، فقہ وغیرہ پر بھی آپنے متعدد کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے "تہذیب الآثار" کی تصنیف آخری عمر میں کی تھی۔ یہ کتاب اپنے فن میں بے نظیر تھی۔ ابتداء ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایات سے ہوتی تھی۔ اور ہر روایت کے علل وطرق، ان سے استنباط مسائل اور اس کے معانی پر پورے بسط کے ساتھ بحث کرتے تھے۔ لیکن ابھی چند ہی اجزاء لکھے تھے کہ انتقال ہوگیا۔

تفسیر اور اس کے ترجمہ سے متعلق

آپ کی تفسیر کا اصل نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" ہے۔ لیکن قدیم رواج کے مطابق شہرت "تفسیر ابن جریر" کے نام سے ہی ہے۔ تفسیر پر اتنی تفصیل کے ساتھ سب سے پہلی کتاب ہے جو اب تک امت کے ہر طبقہ میں متداول ہے۔ بعد کے اکثر مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس کی خوشہ چینی کی ہے اور اس حیثیت سے یہ تفسیر بے نظیر سمجھی جاتی ہے کہ مصنف نے کسی بھی آیت کے سلسلہ میں جتنے بھی اقوال ہو سکتے تھے ان سب کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کوشش اور ہر آیت پر تفصیلی بحث کے نتیجہ میں بہت سی اسرائیلی اور ضعیف، بلکہ بعض موضوع روایات بھی آگئی ہیں۔ لیکن بہر حال مصنف اس کا دعویٰ نہیں کرتے کہ انکی

کتاب کی تمام روایات صحیح ہیں۔ بعض مقامات پر تو خود روایت ذکر کر کے اس پر نقد کر دیتے ہیں اور اس کی حیثیت کو مجروح کر دیتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر کسی بھی مسئلہ کے سلسلہ میں اس پر تفصیلی نظر ڈالنا مقصود تھا۔ روایات اور اقوال کی صحت کا اہتمام نہیں تھا۔ اسی لئے ہر موقعہ پر مصنف نے اپنی رائے پیش کی ہے اور دوسرے اقوال و روایات پر محاکمہ بھی کیا ہے اور ان کی رائے یقیناً بہت صاف اور روایت کے ضعف و سقم سے بے غبار ہوتی ہے۔ درحقیقت مصنف نے ایک ایک آیت پر حدیث اور اقوال صحابہ و تابعین اور علماء فن کی اتنی رائیں جمع کر دی ہیں کہ دیکھنے والے کے سامنے قرآن فہمی کا راستہ کھل جاتا ہے ہم نے ترجمہ میں اس کی کوشش کی ہے کہ تفسیر کی یہ خصوصیت باقی رہے

(۲) امام ابن جریر صرف و نحو کے مباحث براہ راست ائمۂ نحو سے لیتے ہیں اور اس حیثیت سے بھی ان کی تفسیر بے نظیر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے صرف و نحو کے یہ مباحث اتنے دقیق اور مشکل ہیں کہ ان کا ترجمہ اردو داں طبقہ کے لئے قطعاً لاحاصل بلکہ باعث گراں باری ہوگا۔ یہ مباحث تو اچھے اچھے اہل علم کے بس سے بھی باہر ہیں، عوام کے پلے تو کیا پڑیگا! اس لئے جہاں کہیں مصنف نے اس طرح کی تفصیلی بحثیں کی ہیں ان کا ترجمہ ہم نے نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی چیز اس ذیل کی لی ہے تو اس کا خیال رکھا ہے کہ اردو داں طبقہ اسے سمجھ سکے۔ لغت اور قرارت کے مباحث بھی جگہ جگہ تفسیر میں آپ کو بکھرے نظر آئینگے قرآن فہمی کے لئے خصوصاً لغت اور زبان کی مختلف صورتوں کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حد تک سہل کر کے ان مباحث کو اردو میں منتقل کیا جائے۔

کتاب کا ابتدائی حصہ جو تفسیر کے مقدمہ کی حیثیت سے تھا ہم نے سر دست اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے کیونکہ پہلا پارہ بہت ضخیم ہے اور اندازہ ہے کہ تقریباً تین اجزاء میں شائع ہو سکے گا۔ اس لئے ارادہ یہ ہے کہ مقدمہ کو الگ کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اسلامی علوم و معارف کو اردو زبان میں منتقل کرنا بڑی سعادت ہے اور پھر قرآن مجید کی ایک عظیم تفسیر کا ترجمہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل ہے۔ یہ خاکسار مترجم خدا تعالیٰ کی اس بے کراں نعمت کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے کہ تفسیر ابن جریر کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے کام لیا۔ خدا کرے کہ یہ ترجمہ، مترجم کے لئے فلاح دارین کا باعث ہو۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز ——— ظہور الباری۔

اعتذار

ہم نے شروع میں یہ اعلان کیا تھا کہ پہلا پارہ ذی الحجہ میں شائع ہو جائے گا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ممکن نہیں ہے، اور جس مدت میں پارہ پبلش کرنے کا اعلان تھا کام کی وسعت نے بتایا کہ وہ مدت یقینی طور پر اس بڑے کام کے لئے ناکافی تھی۔ اس لئے ہم اپنے تمام ممبران سے معذرت کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اس غیر معمولی تاخیر میں ہماری طرف سے سعی و کوشش میں کسی کوتاہی کو دخل نہیں تھا۔ آئندہ سے انشاء اللہ ہر ڈیڑھ دو ماہ پر ایک جزء ممبران کی خدمت میں پابندی کے ساتھ پہنچتا رہیگا۔ ابتدائی مرحلہ میں چونکہ بعض دشواریاں ہیں اس لئے ہر مہینہ ہمارے لئے پارہ بھیجنا ممکن نہیں۔ انشاء اللہ چند اجزاء کے بعد آئندہ اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ پارہ ہر ماہ ممبران کی خدمت میں بھیجا جا سکے۔۔۔۔

منیجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ

سورہ فاتحہ

قیام مکہ کے زمانہ میں نازل ہوئی، ایک رکوع، ۷ آیتیں، ۲۵ لفظ، ۱۲۳ حروف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں جو مالک ہیں روزِ جزا کے

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا۔

ع صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○

رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ اُن لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے

سورۂ فاتحہ کے نام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سورۂ فاتحہ ام الکتاب ہے، فاتحۃ الکتاب ہے اور سبع مثانی ہے۔ اس کا نام فاتحۃ الکتاب اس لیئے ہے کہ قرآن مجید کی کتابت اسی سورہ سے شروع ہوتی ہے اور نماز میں بھی اسی سے قرأت کی ابتداء کی جاتی ہے، گویا یہ دروازہ ہے کہ قرآن کی دوسری سورتیں اس کے بعد آتی ہیں، کتابت میں بھی اور تلاوت میں بھی!۔ اس کا نام ام القرآن اس لیئے ہے کہ قرآن مجید کی تمام سورتوں پر اسے اولیت حاصل ہے، دوسری سب سورتیں اس کے بعد آتی ہیں، تلاوت اور کتابت دونوں میں! اس

حیثیت سے فاتحۃ الکتاب اور ام الکتاب کے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ام القرآن لسے اس حیثیت سے بھی کہتے ہیں کہ "ام"، کا کلام عرب میں ہر اس جامع چیز پر اطلاق ہوتا ہے جسے بہت سی دوسری چیزوں پر اولیت حاصل ہو اور بہت سے دوسرے اس کے تابع ہوں، اسی لیئے اس جھلی کو جس میں دماغ ہوتا ہے "ام الراس"، کہتے ہیں اور فوجی جھنڈے کو جس کے گرد جمع ہو کر فوجی دستے لڑتے ہیں "ام" کہتے ہیں۔ "سبع"، اس کا نام اس لیئے رکھا گیا ہے کہ اس سورۃ میں سات (سبع) آیتیں ہیں، علماء اور قاریوں میں اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سات آیتیں اس میں کس طرح ہوتی ہیں، علماء کوفہ کے بڑے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی اسی میں سے ہے اور اس طرح اس میں سات آیتیں ہوتی ہیں، صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ لیکن دوسرے علماء کی یہ رائے ہے کہ خود سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اس سورۃ کا جزء نہیں ہے۔ ساتویں آیت اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہے، مدینہ کے قاریوں کے ایک بڑے گروہ کا یہی مذہب ہے۔ پھر آں حضور ؐ نے اس سبع (سات) کو "سبع مثانی"، اس لیئے کہا کہ ہر نماز میں سورہ کی ان سات (سبع) آیتوں کو بار بار (مثانی) پڑھتے ہیں، نفل نماز ہو یا فرض!

اعوذ باللہ

استعاذہ کے معنی ہیں پناہ مانگنا، اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ یعنی میں اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈھتا ہوں، اس کے سوا کسی کی نہیں، شیطانِ رجیم سے کہ وہ میرے دین میں کہیں کوئی رخنہ نہ ڈال دے اور مجھے حق سے نہ پھیر دے۔

شیطان

جن، انسان، جانور اور ہر مخلوق کے سرکش اور متمرد افراد کو کلام عرب میں شیطان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (اور اس طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں شیاطین کو جو جنوں میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی)، آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کی طرح انسانوں کے بھی طبقۂ شیاطین کا ذکر کیا ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ ایک گھوڑے پر سوار ہوئے، وہ سرکشی کرنے لگا، عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کوڑے برسانے شروع کر دیئے لیکن اس کی سرکشی اور بڑھ گئی، آخر آپ اس سے اُتر گئے اور فرمایا کہ تم لوگوں نے تو مجھے ایک "شیطان"، پر سوار کر دیا تھا، جب جان پر بن آئی تو مجھے اترنا ہی پڑا۔

الرجیم

رجیم، فعیل کے وزن پر ہے اور مفعول کے معنی میں، جیسے لعین، ملعون کے معنی میں بولا جاتا ہے، رجیم کا مفہوم ہے دھتکارا ہوا، ملعون جسے بہت برا بھلا کہا گیا ہو، اسی کو مرجوم بھی کہتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ سب سے پہلے جب جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو کہا، اے محمد! کہیئے استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم (میں پناہ مانگتا ہوں اللہ سمیع وعلیم کی شیطان رجیم سے) پھر کہا کہ کہیئے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، پھر کہا کہ پڑھیئے اقرأ باسم ربك الذى خلق، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہی (سورہ اقرأ) سب سے پہلی سورۃ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ نے نازل کی اور آپ کو حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ ڈھونڈھیں، اس کی مخلوق کی نہیں۔

بسم اللہ

بسم اللہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تعلیم دی ہے کہ اپنے تمام افعال اور تمام مہمات کے شروع میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ کا ذکر کریں، یہ تعلیم اور ادب تمام انسانوں کے لیئے بھی ہے کہ سب کو آں حضور ؐ کی پیروی اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ عربی قاعدہ کے اعتبار سے بسم اللہ کی با سے پہلے کسی فعل کا ہونا ضروری ہے، لیکن اس با سے پہلے چوں کہ کوئی فعل بظاہر مذکور نہیں ہے، اس لیئے قدرتی طور پر اسے مقدر ماننا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی سے یہ پوچھے کہ آج تم نے

کیا کھایا اور مخاطب بتائے کہ روٹی: تو قدرتی طور پر اس کی تقدیر یوں ہوگی کہ میں نے روٹی کھائی، اگرچہ یہ پوری عبارت اس نے نہیں کہی تھی، گویا بہت سی عبارتیں متکلم کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں لیکن وہ مقدر ہوتی ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ بھی یہی صورت ہے، لیکن چونکہ بسم اللہ ہر قول و فعل کے شروع میں استعمال کی جاتی ہے، اس لیے اس کے شروع میں فعل کی تقدیر بھی بدلتی رہے گی، مثلاً تلاوت قرآن سے پہلے اگر بسم اللہ پڑھی گئی تو فعل اقرأ یا اتلو (تلاوت کرتا ہوں)، مقدر مانا جائے گا، اگر اٹھنے کے لیے بسم اللہ پڑھی تو اقوم (کھڑا ہوتا ہوں) مقدر مانا جائے گا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جس کی تمام مخلوقات اور ایک ایک ذرہ عبادت و بندگی کرتا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رحمٰن، فعلان کے وزن پر ہے اور رحیم، فعیل کے وزن پر ہے۔ رحم سے دونوں مشتق ہیں فعل یفعل سے فعلان کے وزن پر اسماء لانے کا عرب میں بہت رواج ہے، جیسے غضب سے غضبان سکر سے سکران، عطش سے عطشان اور اسی طرح رحم سے رحمان۔ اسی طرح جب اسماء میں مدح و ذم کے معنی ہوں تو اہل عرب انھیں فعیل کے وزن پر استعمال کرتے ہیں، جیسے علم، عالم، علیم اور قدر، قادر، قدیر۔ رحمٰن اور رحیم اگرچہ دونوں اسم ہیں اور ایک ہی فعل "رحمۃ" سے مشتق ہیں، لیکن دونوں کے مفہوم میں فرق ہے، لغت کے اعتبار سے بھی لفظ رحیم کے مقابلے میں رحمان میں رحمت کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے، اس کے علاوہ عزرمیؒ سے بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے حق میں رحمان ہے اور مؤمنین کے حق میں رحیم ہے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ رحمان ہے دنیا کے لیے بھی اور آخرت کے لیے بھی، لیکن وہ رحیم ہے صرف آخرت[1] کے لیے۔ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے رحیم ہے جیسا کہ بیان کیا گیا۔ رحیم میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے، اس لیے رحیم کا تعلق بہر حال مؤمنین ہی سے ہوگا۔ دنیا میں مؤمنین پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسان و لطف تو یہی ہے کہ انھیں اس نے اپنی طاعت و بندگی کی توفیق دی ہے، ایمان کی دولت بخشی ہے اور احکام کی بجا آوری اور گناہوں سے اجتناب کا جذبہ دیا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں کفار، اس کی بندگی سے انکار، اس کی خدائی میں شرک اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان تمام اعمال کی جزاء کی جگہ دار آخرت ہے، وہاں مؤمنین کے اعمال کی جزاء جنت اور اللہ کی رضا ہے، لیکن کفار کے کفر اور برے اعمال کا بدلہ ناکامی اور عذاب کے سوا اور کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ مؤمنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص رحم و کرم کا معاملہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں سے دنیا میں مسلمانوں کی طرح کفار بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کے افضال و احسان یہاں غیر محدود ہیں، روزی سب کو دیتا ہے، بارش سب کے لیے برستی ہے، ہرے بھرے کھیت سب ہی کے ہیں اور صحت و عقل بھی کسی خاص طبقہ کی میراث نہیں، دنیا میں ایسی ہی ہزار ہا نعمتیں اور احسانات ہیں جن سے ساری مخلوق فیض یاب ہوتی ہے اور جن کی کوئی حد و انتہا نہیں، اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (اگر اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو ان کا کوئی شمار نہیں کر سکتے) حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ رحمان اللہ تعالیٰ کے ان اسماء میں سے ہے جو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، کسی بندے کو رحمان کہنا منع ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

یعنی شکر صرف اللہ جل شانہ کا ہے، کہ اس کی نعمتیں غیر محدود اور اس کے احسانات بے شمار ہیں، اسی نے انسانوں کو اعضاء و جوارح دیئے، طاقت و قوت دی تاکہ اس کے فرائض و واجبات ادا کر سکیں، روزی دی اور سب کچھ دیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد! اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہیے، ابن عباس

[1] یعنی جن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے، وہ آخرت میں اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اللہ چاہے تو دنیا میں بھی انھیں پکڑ لے لیکن دنیا میں اس کی رحمت وسیع ہے، اس لیے گنہ گاروں کو یہاں ڈھیل دی جاتی ہے (مترجم)

رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ شکر ہے اور اس کی نعمت وہدایت، کا اقرار واعتراف کرنا ہے۔ حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم نے الحمد للہ رب العالمین کہا تو اللہ کا شکر ادا کیا، اب وہ تم پر اپنے انعامات اور زیادہ کرے گا۔ کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ الحمد للہ، اللہ کی ثناء وتعریف ہے۔ اسود بن سریع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد سے زیادہ اور کوئی چیز پسند نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تعریف الحمد للہ سے کی۔ بہرحال الحمد للہ شکر ہے اور شکر، حمد کے مواقع پر بھی کیا جاتا ہے۔ الحمد کے شروع میں الف لام سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تمام محامد اور کامل ثناء اللہ کے لیئے خاص ہے۔ الحمد میں تمام قاریوں اور امت کے علماء نے دال کا رفع پڑھا ہے، اور اسی سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تمام محامد اللہ کے ساتھ خاص ہیں، کیونکہ وہ اللہ ہے اور اس نے اپنے بندوں پر وہ انعامات کیئے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں، اس کی نعمتیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، انسانوں کے اعمال سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

رَبّ

ربّ، کلام عرب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے، آقا جس کی اطاعت کی جاتی ہو، اسے بھی رب کہتے ہیں، ایسے شخص کو بھی رب کہتے ہیں جو کسی چیز کی اصلاح وتدبیر کرتا ہو، بولتے ہیں "فلان یرب صنعتہ عند فلان" مراد کام کی اصلاح وتمام سے ہے۔ کسی چیز کے مالک کو بھی اس کا رب کہتے ہیں، اس طرح ہمارا رب جل ثنارہ بھی سید وسردار ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، اپنی مخلوق کے امور کا مصلح ہے اور مالک ہے خلق وامر سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا، اے محمد! کہیئے "الحمد للہ رب العالمین"، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جبریل علیہ السلام نے کہا، کہیئے کہ تمام تعریف اس اللہ کے لیئے ہے (الحمد للہ) جس کی تمام مخلوق ہے، سارا آسمان اور جو کچھ اس میں ہے، ساری زمین اور جو کچھ اس میں ہے، اور جو کچھ آسمان وزمین کے درمیان میں ہے، جو آپ جانتے ہیں اور جو آپ نہیں جانتے، سب اللہ کے لیئے ہے، اے محمد! آپ کے رب سے کوئی چیز مشابہ نہیں۔

العالمین

عالمین، عالم کی جمع ہے، عالم بھی جمع ہے لیکن اس کا کوئی واحد نہیں، جیسے انام (مخلوق) اور جیش (لشکر) وغیرہ کہ ان اسمار کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے، لیکن انہیں لفظوں میں ان کے واحد نہیں ہوتے۔ مخلوق کے مختلف طبقوں کا نام عالم ہے۔ ہر طبقہ ایک عالم ہے، اسی طرح ہر طبقہ ہر زمانہ میں اسی زمانہ کے اعتبار سے ایک عالم ہے۔ انسان ایک عالم ہے اور ہر زمانہ کے انسان اس زمانہ کے عالم ہیں۔ اسی طرح جنات بھی ایک عالم ہیں اور مخلوق کے تمام طبقے الگ الگ عالم ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ "عالمین" جمع میں استعمال ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رب العالمین یعنی جن وانس کا رب، سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے کہ رب العالمین سے مراد ابن آدم اور جنات ہیں، ہر جنس الگ الگ عالم ہیں۔ مجاہد سے بھی رب العالمین کی تفسیر میں جن وانس ہی منقول ہے۔ قتادہ نے فرمایا کہ ہر طبقہ ایک عالم ہے۔ ابو العالیہ سے رب العالمین کی تفسیر میں منقول ہے کہ انسان ایک عالم ہے، جن ایک عالم ہے، اس کے علاوہ زمین پر ملائکہ کے اٹھارہ ہزار یا چودہ ہزار اور عالم ہیں، راوی کو شک تھا، اور زمین کے چار زاویئے ہیں، ہر زاویہ پر ساڑھے تین ہزار عالم ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیئے پیدا کیا ہے[1]۔

بسم اللہ اور سورۂ فاتحہ

الرحمن الرحیم، یہ لفظ پہلے بسم اللہ میں گذر چکا ہے۔ پھر فوراً ہی دوبارہ اللہ کی صفات میں ان دونوں الفاظ کا لانا یہ بتاتا ہے کہ بسم اللہ، سورۂ فاتحہ میں سے نہیں ہے ورنہ ایک ہی سورہ میں

---

[1] اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات کا علم ہمیں نہیں ہے۔ جتنی مخلوقات ہم جانتے ہیں ان سے کہیں زیادہ وہ ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ قدیم مسلمان محققین نے بھی اللہ تعالیٰ کی پراسرار مخلوقات سے متعلق تحقیقات کی ہیں اور جہاں تک وہ تحقیق کر سکے ہیں اپنی ضخیم مجلدات میں ان پر روشنی ڈالی ہے اور موجودہ دور میں بھی اس موضوع پر تحقیقات ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جاندار اور غیر جاندار مخلوقات سے متعلق ان کی کتابیں حیرت انگیز انکشافات سے بھری ہوئی ہیں اور پھر بھی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ (مترجم)

بلاکسی خاص فصل کے یوں یہ صفات ذکر ہوتیں۔

اختیارِ کامل، فیصلے کے دن

مالك يوم الدين اس کی ایک قرارت مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ بھی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت کے دن سلطانی اور حکومت صرف اللہ ہی کی باقی رہ جائے گی، اس سے پہلے جو حکمراں اور بادشاہ دنیا میں تھے وہ سب فنا ہو چکے ہوں گے، آج صرف اسی کی عظمت و جبروت ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (آج سلطانی کس کی ہے؟ صرف اللہ واحد و قہار کی)، مالك يوم الدين کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس دن، آخرت میں، اللہ کے سوا فیصلہ کا اور کوئی مالک نہ ہوگا، دنیا کی طرح انھیں (آج فیصلہ کا کوئی اختیار باقی نہ رہے گا)، لا يتكلمون الا لمن اذن له الرحمن وَقَالَ صَوَابًا (کوئی ایک لفظ بھی نہ نکال سکے گا، سوا ان کے جنھیں رحمان اجازت دے اور کہیں گے بات ٹھیک) وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (اور رحمان کے سامنے آوازیں پست ہو جائیں گی)، میرے نزدیک زیادہ صحیح قرارت پہلی ہی ہے یوم الدین میں لفظ دین حساب اور جزار اعمال کے معنی میں ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ" (ہرگز نہیں تم جھٹلاتے ہو جزار کو (یعنی قیامت کے دن کو) میں بھی دین جزار ہی کے معنی میں ہے فَلَوْلَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ میں بھی مدینین سے مراد جزار اعمال اور حساب ہی ہے۔ کلام عرب میں حساب و جزار کے علاوہ لفظ دین دوسرے بہت سے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن کی تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔ یہاں ہم نے دین کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہی بہت سے اسلاف سے منقول ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے "یوم الدین" کے متعلق فرمایا کہ مراد مخلوق کے حساب کے دن سے ہے یعنی روزِ قیامت، جب انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا، اگر اچھے ہوں گے تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر برے ہوئے تو برا۔ البتہ جن لوگوں کو معافی مل جائے گی تو ان کا معاملہ الگ ہوگا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ رض سے بھی اس کی تفسیر یوم حساب (یعنی یوم قیامت) ہی منقول ہے۔

ہمارا معبود

ایاك نعبد یعنی تیرے ہی لیے، اے اللہ! ہم تیرے ہی سامنے خشوع کرتے ہیں اور عجز و زاری کرتے ہیں، تیرا اقرار کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تیری ہی ربوبیت کا، تیرے سوا کسی کا نہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، آپ نے بیان کیا کہ جبریل علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اے محمد! کہیے، ایاك نعبد، اے ہمارے رب! ہم تجھے ہی یہ مانتے ہیں، تجھی سے ڈرتے ہیں اور تجھی سے امید رکھتے ہیں، تیرے سوا اور کسی سے نہیں۔ ایاك نستعین۔ یعنی اے ہمارے رب! ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں، اس عبادت و طاعت میں جو ہم تیرے لیے کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات میں، تیرے سوا اور کسی کی مدد ہمیں مطلوب نہیں، وہ تیرا کفر کرنے والے ہیں جو تیرے سوا اور کسی سے مدد مانگتے ہیں، ہم تو بس تجھی سے مدد مانگتے ہیں، اپنے تمام معاملات میں اور اخلاص کے ساتھ تیری عبادت کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل ہے کہ تیری طاعت و بندگی اور اپنے تمام معاملات میں ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ کلمات اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھائے ہیں کہ ہم اس سے اسی طرح مانگیں کہ جس طرح یہ دعار زمانہ حال کے لیے ہے اسی طرح زمانہ آئندہ کے لیے بھی ہے۔

صراط مستقیم

اهدنا الصراط المستقیم یعنی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس پر ثابت قدم رکھ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے محمد! کہیے، اهدنا الصراط المستقیم یعنی ہمیں سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق دیجیے۔ یہاں بھی ایاك نستعین کی طرح بندہ اللہ رب العزت سے طاعت و عبادت پر ثبات و استقامت کی توفیق اور اوامر و نواہی میں اس کے منشار کے مطابق عمل کی دعار مانگتا ہے کہ آنے والی عمر میں اس پر استقامت حاصل رہے۔

اس پورے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیرا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، تیری عبادت ہم اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں، تیرے سوا کسی معبود یا بت کی پوجا نہیں کرتے۔ اس لیے ہماری عبادت و طاعت میں مدد کر اور ہمیں اس پر قائم

و ثابت رہنے کی توفیق عطا فرما، جیساکہ تو نے ان لوگوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی جن پر تو نے انعام و اکرام کیا تھا یعنی انبیاء اور تیرے دوسرے فرمانبردار بندے۔ بعض مفسرین نے اھدنا کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ ہمیں اور زیادہ ہدایت عطا فرما۔ بعض نے کہا کہ مطلب یہ ہے، ہمیں آخرت میں جنت کی طرف لے جانے والے راستہ پر چلا۔ لیکن صحیح مفہوم یہی ہے کہ اس میں ہدایت پر، عمر کے آنے والے دور میں، ثبات واستقلال کی دعاء مانگی گئی ہے۔ کلامِ عرب میں بھی اسی معنی کے لیے اس کا استعمال عام ہے۔ الصراط المستقیم، مفسرین کا اجماع ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد یہاں ایسا واضح اور صاف راستہ ہے جس میں کسی قسم کا ٹیڑھا پن نہ ہو۔ لغتِ عرب میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس راستہ پر ثبات واستقامت کی توفیق عطا فرما جس میں تیری رضا اور خوشنودی ہے اور جس کی تو نے اپنے ان بندوں کو توفیق عطا فرمائی جن پر تو نے انعام کیا تھا، جو انبیاء، صدیقین اور شہداء کا راستہ ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا، اے محمد! پڑھیئے اھدنا الصراط المستقیم یعنی ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کیجیے جو اللہ کا دین ہے اور جس میں کسی قسم کی کجی نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ صراطِ مستقیم، اسلام ہے۔ ابنِ مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی یہی روایت ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد اسلام ہے۔ ابو العالیہ نے فرمایا کہ صراطِ مستقیم سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں ساتھی یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، عاصم نے بیان کیا کہ جب میں نے ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابو العالیہ نے سچ کہا اور خیر خواہی کی۔ صراط الذین انعمت علیہم یہ جملہ صراطِ مستقیم کی مزید وضاحت کے لیے آیا ہے۔ حق کی طرف لے جانے والا ہر راستہ صراطِ مستقیم ہے، اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ اے ہمارے رب! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کر، جو ان بندوں کا راستہ ہے جن پر تو نے اپنی طاعت وعبادت کی توفیق دے کر، انعام کیا، یعنی تیرے ملائکہ، تیرے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صراط الذین انعمت علیھم یعنی ان کا راستہ جن پر تو نے اپنی طاعت وعبادت کی توفیق دے کر انعام کیا ہے، ملائکہ، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ کہ جنھوں نے تیری عبادت واطاعت کی ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انعمت علیہم سے مراد انبیاء کرام ہیں۔ ابن عباس رضہ سے ایک روایت یہ ہے کہ مراد مؤمنین ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی طاعت و بندگی بھی اس کا بہت بڑا فضل وانعام ہے اور اس کی توفیق بھی انھیں بندوں کو ملتی ہے جن پر اللہ کا انعام ہو، آیت میں بندوں کی تمام طاعت وعبادت کو اللہ ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ غیر المغضوب علیھم یہ مغضوب علیہم (جن پر اللہ کا غضب ہوا) جن کے متعلق اللہ کا حکم ہے کہ ہم دعا کرتے رہیں کہ ہمیں ان میں سے نہ بنائے، وہ طبقہ ہے جس کی نشان دہی قرآن مجید کی اس آیت میں کی گئی ہے "ھَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ (کیا خبر دوں میں تم کو اس سے زیادہ برا باعتبار بدلے کے اللہ کے نزدیک وہ شخص ہے جس پر لعنت کی ہو اللہ نے اور اس پر غضب کیا ہو اور ان میں سے بندر اور خنزیر اور شیطان پرست کیے ہوں، یہ ہیں بہت برے باعتبار جزا کے اور گمراہ راہِ راست سے (یعنی بنی اسرائیل) چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "المغضوب علیہم" سے مراد یہود ہیں۔ عبد اللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ وادی القریٰ (یہودیوں کی ایک بستی) کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، انھوں نے پوچھا، یا رسول اللہ! یہ آپ کے محاصرہ میں کون لوگ ہیں؟ آں حضورؐ نے فرمایا کہ "مغضوب علیہم" یہود ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، غیر المغضوب علیھم یعنی یہود جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، ابنِ مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ غضب کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں، بعض حضرات نے

کہا ہے کہ غضب سے مراد ہے ان لوگوں کو عقوبت وسزا دینا جن پر اس کا غضب ہوا ھل انبئکم بشر من ذالک مثوبتا الخ میں لفظ غضب کا یہی مفہوم ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب کیا ان کی مذمت کی اور ان کے اعمال واقوال پر انھیں ملامت کی۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ غضب کا جو حقیقی مفہوم لغت میں ہے وہی یہاں بھی مراد ہے اور اللہ کا غضب اس کی شان کے مطابق ہے مخلوق کے غضب جیسا نہیں۔ "ولا الضالین" اہل بصرہ کا خیال ہے کہ لا الضالین میں لا صرف تتمیم کلام کے لیئے ہے، ورنہ یہاں معنی اس کے کچھ بھی نہیں لیئے گئے ہیں اور لا حذف کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ آخری قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ لاؔ، کلام عرب میں غیر کے ساتھ حذف ہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غیر کے تین معنی کلام عرب میں آتے ہیں، پہلا استثناء، دوسرا جحد اور تیسرا سوی۔ اور یہاں المغضوب علیہم کے ساتھ غیر کا معنی جحد ونفی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ طبقہ "الضالین"، کون ہے جن کے راستے اور طریقے سے پناہ مانگنے کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اس کا جواب اس آیت میں ہے "یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا اَھْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ" (اے اہل کتاب دین کے معاملہ میں غلط قسم کا غلو نہ کرو اور ان قوموں کی اتباع نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکی ہیں اور جنھوں نے دوسروں کو بھی بہت گمراہ کیا اور خود بھی راہ راست سے ہٹ گئے) ۔یعنی نصاریٰ)۔ عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ان کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے حضور اکرمؐ سے ولا الضالین کے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ نصاریٰ ہی ضالین (گمراہ) ہیں۔ عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنی قین کے ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ اس وقت وادی قریٰ کا محاصرہ کیئے ہوئے تھے اور اپنے گھوڑے پر سوار تھے، انھوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا، یہ ضالون (گمراہ) نصاریٰ ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نصاریٰ کے طریقہ کے سوا جنھیں اللہ نے گمراہ کیا۔ بیان کیا کہ مطلب یہ ہے اے اللہ! ہمیں اپنے دین حق پر چلنے کی توفیق عطا فرما، اور وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، تاکہ تیرا غضب ہم پر نہ نازل ہو جیسا کہ یہودیوں پر نازل ہوا، اور نہ ہم گمراہ ہوں جیسا کہ تو نے نصاریٰ کو گمراہ بنایا اور اس طرح ہم تیرے اس عذاب سے بچ جائیں جو تو نے ان لوگوں پر کیا تھا، اپنی مہربانی، رحمت اور قدرت کے صدقے ہمیں اس سے محفوظ رکھ۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں، اور ہر وہ شخص جو سیدھے راستے سے ہٹ چکا ہو اور غلط راستے پر چلے، وہ عرب کی زبان میں "ضال"، کہلاتا ہے، نصاریٰ کو بھی ضال (گمراہ) اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ راہ حق کے اختیار کرنے میں انھوں نے غلطی کی ہے اور دین کے سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ اگرچہ یہی حال یہودیوں کا بھی ہے کہ وہ سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں، لیکن نصاریٰ کی صفت "الضالین" اور اس کے مقابلے میں یہودیوں کی صفت المغضوب علیھم اس لیئے لائے ہیں تاکہ دونوں طبقوں کی جو انفرادی خصوصیت ہے وہ بھی ملحوظ رہے۔ ورنہ غلط روی اور عقیدہ وعمل کی برائی میں دونوں ایک دوسرے سے آگے ہیں۔ قرآن مجید کی یہ سورۃ حمد، تمجید، ثناء اور خداوند قادر وتوانا کی عظمت وقدرت کے عجیب دلپذیر بیانات پر مشتمل ہے اور اسی لیئے یہ ام القرآن ہے، پورے قرآن کا عطر!۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد بیان کی جب الرحمٰن الرحیم پر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی، جب مالک یوم الدین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تمجید کی اور یہ میرے لیئے تھا، پھر جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین ختم سورۃ تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بندہ کے لیئے ہے۔ اسی مضمون کی ایک حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہو گئی ہے اور بندہ جو مانگے گا اسے ملے گا۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

سُوْرہ بقرہ

قیام مدینہ کے زمانہ میں نازل ہوئی۔ چالیس رکوع، ۲۸۶ آیتیں، ۶۰۲۱ لفظ، ۲ ہزار حروف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

معؔ الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

الم یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنیوالوں کو، وہ خدا سے ڈرنیوالے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں

بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا

چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اُس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ أُولٰٓئِكَ

پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے، اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں پس یہ لوگ ہیں

عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب

الٓمٓ	اس لفظ کی تفسیر مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن کے بہت سے ناموں میں سے یہ بھی ایک نام ہے، قتادہ، مجاہد اور ابن جریج رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ افتتاح کلام کیلئے

(حاشیہ متعلقہ صـ۱۲) **ع۵** امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کو صرف یہود و نصاریٰ کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ تمام عملی غلط روی اختیار کرنے والوں کو طبقہ "مغضوب علیہم" میں رکھا جائے اور تمام اعتقادی غلط روی اختیار کرنے والوں کو طبقہ "ضالین" میں رکھا جائے۔ یہودی عملی غلطی اور بے راہ روی میں مبتلا تھے کہ حق کو جان بوجھ کر چھپاتے تھے اور اللہ کے کلام کو دُنیا کی حقیر پونجی کے بدلے بیچتے تھے۔ اور نصاریٰ اعتقادی بے راہ روی کے شکار تھے۔ دوسرے مفسرین نے جو "مغضوب علیہم" یہودیوں کی صفت اور "ضالین" نصاریٰ کی صفت بتائی ہے وہ اسی معنی کے اعتبار سے ہے (مترجم)

ہے، اللہ تعالیٰ اس لفظ سے قرآن کریم کی بعض سورتوں کو شروع کرتے ہیں۔ یہ قول ہی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، انھوں نے فرمایا کہ الٓمٓ، حٓمٓ، المٓصٓ اور صٓ افتتاح کلام کے لیئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے قرآن کریم کی بعض سورتوں کی ابتداء کی ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ سورہ کا نام ہے، زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے یہی نقل ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ اللہ کا نام ہے، سدی اور شعبی رحمۃ اللہ علیہما سے یہ قول منقول ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ قسم ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اسماء و افعال سے الگ کیئے ہوئے حروف (حروف مقطعات) ہیں اور اس کا ہر حرف ایک الگ مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو دوسرے حرف کے مفہوم سے مختلف ہے۔ مثلاً ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ الٓمٓ کا مطلب ہے "انا اللہ اعلم" (یعنی میں اللہ ہوں، سب سے زیادہ جاننے والا) حضرت ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ الٓمٓ میں میم اللہ جل ثنارہ کے اسماء سے نکلا ہوا ایک حرف ہے۔ حضرت ربیع بن انس نے فرمایا کہ اس کا ہر حرف ایسا ہے جس سے اللہ کے کسی نام کی ابتداء ہوتی ہے، اس کا ہر حرف اللہ کی نشانیوں پر دلالت کرتا ہے اور ہر حرف سے امتوں کی مدت اور ان کی زندگی اور موت کا تعیین ہوتی ہے، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ حیرت ہے، لوگ اللہ کا نام لیتے ہیں اور اس کی دی ہوئی روزی کھا کر زندہ رہتے ہیں اس کے باوجود اس کا کفر کرتے ہیں، فرمایا کہ الف سے اللہ تعالیٰ کا نام "اللہ" شروع ہوتا ہے۔ لام سے لطیف اور میم سے مجید، اس لفظ کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں اصحاب لغت کے بھی اقوال مختلف ہیں اور ان مختلف اقوال کے لیئے کلام عرب سے استشہاد بھی کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک ان تمام اقوال میں ربیع بن انس کا قول زیادہ درست ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے کئی معانی ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانوں کی ایک جماعت کو امت کہتے ہیں، کسی اچھے دور کو بھی امت کہتے ہیں، اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندے کو بھی امت کہتے ہیں اور دین و ملت کو بھی امت کہتے ہیں، اس طرح کے الفاظ کی لغت عرب میں کوئی کمی نہیں ہے، یہی حال یہاں پر ان حروف کا بھی ہے کہ ہر ہر حرف متعدد معانی پر دلالت کرتا ہے۔ افتتاح کلام کے لیئے اس طرح کے جتنے حروف مختلف سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں، مثلاً الٓمٓ، الٓمٓرٰ اور المٓصٓ وغیرہ ان میں سے ایک ایک حرف متعدد اور مختلف معانی پر دلالت کرتا ہے، اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر مشتمل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے علاوہ بھی متعدد سورتوں کا افتتاح اپنی حمد و ثناء اور تعظیم و تمجید سے کیا ہے، اس لیئے ان حروف کے ساتھ افتتاح بھی جو اس کے اسماء و صفات پر دلالت کرتے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہوگی اس کے علاوہ ہم نے جتنے احتمالات اور تاویلات ان حروف کی تفسیر میں بیان کی ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ مناسب اور درست ہیں کیونکہ ان میں سے کسی میں بھی کوئی استبعاد نہیں۔

خدا کی کتاب

ذالک الکتاب ای ھذا الکتاب (یعنی یہ کتاب) مجاہد عکرمہ، ابن جریج اور سدی رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے کہ ذالک یہاں ھذا کے معنی میں ہے۔ ذالک اسم اشارہ ہے اور اس سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو سامنے موجود نہ ہو بلکہ کہیں دوسری جگہ ہو، اس کے برخلاف ھذا، اشارہ قریب کے لیئے آتا ہے یعنی اس لفظ سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو موجود ہو، نظروں کے سامنے ہو۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا لفظ جو بعید اور غائب کے اشارہ کے لیئے استعمال ہوتا ہے، اسے اشارہ قریب اور حاضر کے معنی میں کس طرح لیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو مخاطب کے سامنے سے ابھی ابھی گذری ہو وہ اگرچہ غیر حاضر اور بعید ہو گئی لیکن بیان کرتے وقت اسے حاضر اور قریب کی طرح بیان کر دیتے ہیں کیونکہ ابھی وہ اتنی بعید نہیں ہوئی ہوتی کہ ذہن سے اتر جائے۔ کلام اور محاوروں میں اس طرح کے استعمالات بکثرت ہوتے ہیں، اور یہاں بھی یہی حال ہے کہ الٓمٓ مختلف معانی و وجوہ پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ اے محمد! یہ جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے یہی کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر ھذا کے مقابلے میں ذالک زیادہ بلیغ ہے کہ یہ لفظ الٓمٓ کے معانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ذالک الکتاب سے اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں کی طرف اشارہ کیا ہو جو مکہ یا مدینہ میں سورہ بقرہ سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، گویا اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتا ہے کہ اے محمد! کتاب کی جو سورتیں

میں آپ پر پہلے نازل کرچکا ہوں، یہی وہ کتاب ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر مفسرین نے ذالک کو ھذا کے معنی میں لیا ہے کیونکہ جو سورتیں سورہ بقرہ سے پہلے نازل ہو چکی ہیں وہ بھی ہماری اسی کتاب کا...... حصّہ ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ بہتر ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ذالک الکتاب سے مراد توراۃ اور انجیل وغیرہ ہے۔ لا ریب فیہ یعنی اس میں کوئی شبہ نہیں۔ مجاہد، عطار، قتادہ اور سدی سے یہی تفسیر منقول ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضؓ سے بھی یہی روایت ہے۔ یہ "رابنی الشئ یُریبنی رَیْبًا" سے مصدر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے اور متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔

اور اس کی خصوصیت

"ھدیً" شعبیؒ نے فرمایا کہ ھدیٰ یعنی گمراہی سے ہدایت ہے۔ ابن عباس، ابنِ مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضؓ سے منقول ہے کہ ھدیً للمتقین یعنی متقیوں (خدا سے ڈرنے والوں) کے لئے نور ہے۔ ھدیً یہاں ھدیت فلانًا الطَّریق سے مصدر ہے، اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو راستہ بتا دیں۔ اور ہاں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی وضاحت کردی ہے، کہ یہ کتاب صرف متقین ہی کے لیے نور ہے اور صرف مومنین ہی کے لیے ہدایت ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی متقین کے ساتھ اسے خاص نہ کرتے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کتاب سے ہدایت صرف مومن کو مل سکتی ہے جو اپنے انکار اور کفر پر اڑا ہوا ہے اس پر تو صرف اتمام حجت کردی گئی ہے۔ للمتقین حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ متقین وہ ہیں جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچتے ہیں اور فرائض کو ادا کرتے ہیں۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ متقین وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی سزاؤں سے ڈرتے ہیں اور اس لیے ہدایت کے ذریعہ ایسی چیزوں کو معلوم کرکے چھوڑ دیتے ہیں جو اس کی سزا کا موجب ہوں اور حضور اکرمؐ کی لائی ہوئی شریعت کی تصدیق کرکے اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ متقین سے مراد مؤمنین ہیں۔ کلبی سے روایت ہے کہ متقین وہ ہیں جو کبائر سے بچتے ہیں۔ سب سے مناسب تفسیر یہی ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں جو گناہ کرتے ہوئے اللہ سے ڈرتے ہیں اور اس لیے اس کی نافرمانی کے قریب نہیں جاتے اور اس کے احکام و فرائض کے بارے میں بھی اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس لیے ان کی ادائیگی کرتے ہیں، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے جب تقویٰ کو کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے تو کسی انسان کے لیے کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ اس میں قید لگائے اور اسے محدود کردے۔ الذین یومنون بالغیب، .... ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یومنون کا مطلب ہے کہ وہ تصدیق کرتے ہیں۔ ربیع سے منقول ہے کہ یومنون کا مفہوم ہے "وہ ڈرتے ہیں" کلام عرب میں ایمان کے معنی تصدیق ہی کے ہیں، اگر کوئی شخص کسی چیز کی زبان سے تصدیق کرے تو اسے مومن کہتے ہیں، اسی طرح اپنے قول کی عمل سے تصدیق کرنے والے کو بھی مومن کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا" (اور تو ہماری تصدیق نہیں کرے گا) میں بھی مومن مصدق کے معنی میں ہے۔ اللہ سے خشیت اور ڈر بھی ایمان کے مفہوم میں داخل ہے، خصوصًا جبکہ اس سے عملاً تصدیق مراد لی جائے۔ ایمان ایک جامع کلمہ ہے، اللہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اقرار، سب کچھ اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اس اقرار کی عملاً تصدیق بھی! مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو غیب کی تصدیق کرتے ہیں، قول، اعتقاد اور عمل سے۔ بالغیب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غیب سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کو انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غیب وہ چیزیں ہیں جو انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، یعنی جنت و دوزخ کے معاملات اور وہ تمام امور جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے اور پہلے سے وہ معلوم نہیں تھیں، اشارہ عرب کے ان مؤمنین کی طرف ہے جن کے یہاں قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب آسمانی تھی اور نہ ان امور کا کوئی علم ہی تھا۔ حضرت زر سے منقول ہے کہ غیب سے مراد قرآن مجید ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "الذین یومنون بالغیب" یعنی وہ ایمان رکھتے ہیں جنت و دوزخ پر، بعث بعد الموت پر اور قیامت

کے دن پر! اور یہ تمام امورِ غیب ہیں۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل ہے۔ اصلاً غیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سامنے موجود نہ ہو۔ مفسرین کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یومنون بالغیب کے خصوصی مخاطب کون لوگ تھے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس جملہ کے خصوصی مخاطب صرف مؤمنین عرب تھے، جو اہلِ کتاب ایمان لائے تھے وہ اس سے مراد نہیں ہیں، کیونکہ اسی کے بعد مؤمنین اہلِ کتاب کا ذکر ہوا ہے " الذین یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك "، (اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا اور اس پر جو آپ سے پہلے اتارا گیا ہے)، اہلِ عرب کے پاس قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہ تھی، اور واضح طور پر اس آخری آیت کے مصداق مومنین اہلِ کتاب ہیں اس لیے اس سے پہلے والی آیت یومنون بالغیب کے مصداق مؤمنین عرب ہوں گے۔ ابن عباس، ابنِ مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے کہ " الذین یومنون بالغیب "، سے مراد مؤمنین عرب ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور غیب وہ امور ہیں جو بندوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں یعنی امورِ جنت و دوزخ اور وہ تمام چیزیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ذکر کیا ہے اور جن کی تصدیق اہلِ عرب نے اس سے پہلے نہیں کی تھی کہ ان کے پاس نہ اس کا کوئی علم تھا اور نہ کوئی کتاب تھی، اور " والذین یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك وبالاٰخرۃ ھم یوقنون "، سے مراد مؤمنین اہلِ کتاب ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہاں پر مذکورہ چاروں آیتیں خاص مومنین اہلِ کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہیں، کیونکہ وہ قرآن پر ان تفصیلات کے ساتھ ایمان لائے تھے جن میں سے بعض ان کے لیے بھی غیب کا حکم رکھتی تھیں، لیکن جب اللہ نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا اور انھیں بتایا کہ یہ ہماری طرف سے ہے تو وہ اس پر ایمان لائے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ چاروں آیتوں سے مراد ہر وہ مومن ہے جس میں وہ صفات پائی جاتی ہوں جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے، اس کی کوئی تخصیص نہیں کہ وہ عجمی ہے یا عربی، اہل کتاب میں سے ہے یا دنیا کے کسی دوسرے طبقہ اور جماعت سے تعلق رکھتا ہے، یہ خیال مشہور مفسرِ قرآن حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ان سے روایت ہے کہ سورۂ بقرہ کی چار آیتیں مؤمنین کی تعریف میں ہیں، دو میں کفار کی صفات بیان ہوئی ہیں اور تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ کی ابتدائی چار آیتیں مومنین کے حق میں ہیں اور دو غزوہ احزاب کے کفار قائدوں کے حق میں ہیں، میرے نزدیک زیادہ مناسب پہلا قول ہے۔ ویقیمون الصلوٰۃ نماز کی اقامت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے حدود، فرائض وواجبات کی رعایت کے ساتھ اسے ادا کیا جائے " اَقَامَ الْقَوْمُ سُوْقَھُمْ "، اس وقت بولتے ہیں جب بازار میں خرید وفروخت کی گرم بازاری ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اقامت صلاۃ یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ پوری طرح ادا کیا جائے، پوری طرح تلاوت کی جائے۔ خشوع ہو اور نماز میں پوری طرح توجہ ہو۔ الصلاۃ ضحاک سے روایت ہے کہ صلاۃ (نماز) سے مراد فرض نماز ہے۔ کلامِ عرب میں صلاۃ، دعا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے وممارزقنھم ینفقون "، ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " وممارزقنھم ینفقون "، (اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں) سے مراد زکاۃ ہے۔ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے، یہ حکم، زکاۃ کے حکم کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ مراد وہ نفقات ہیں جو آدمی اپنی حیثیت و اوقات کے مطابق ثواب کی نیت سے کرتا ہے، اس کے بعد سورۂ براءۃ کی سات آیتوں میں زکاۃ کا حکم نازل ہوا۔ لیکن اس کی سب سے بہتر تفسیر یہ ہے کہ مراد وہ تمام اخراجات لیے جائیں جنھیں انسان ادائیگی فرض کے لیے کرتا ہے، اس میں زکاۃ بھی شامل ہے اور وہ اخراجات بھی جو انسان اپنے اہل وعیال پر کرتا ہے جن کی پرورش اس کے ذمہ ضروری ہوتی ہے۔ " والذین یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك "، اس کی تفسیر تو پہلے ہو چکی کہ اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ جو تصدیق کرتے ہیں ان تمام چیزوں کی جو آپ پر اللہ عزوجل کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور ان کی جو آپ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی تھیں، نہ ان میں کوئی تفریق کرتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں " وبالاٰخرۃ ھم یوقنون "

آخرة، دار (گھر) کی صفت ہے اور اسے 'آخرة' (آخری) اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ایک دار تھا (دنیا) اور یہ اس کے بعد آئے گا، تو یہ دار (گھر) اس حیثیت سے 'آخرة' (آخری) ہوا کہ اس سے پہلے ایک دار (دنیا) متحقق ہو چکا ہوگا۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بالآخرة ھم یوقنون سے مراد بعث، قیامت، جنت، دوزخ، حساب اور میزان پر یقین و ایمان ہے یعنی وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ پہلی کتابوں پر وہ ایمان لائے، لیکن آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں اس کا یہ انکار کرتے ہیں تو آیت کے حکم میں یہ طبقہ داخل نہیں ہے۔

اولٰئك علیٰ ھدی من ربھم واولٰئك ھم المفلحون۔ اس آیت کی تفسیر بھی کئی طرح کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ دونوں طبقے ہیں جن کا ذکر پہلی آیتوں میں ہوا، یعنی غیب پر ایمان لانے والے عرب اور وہ اہل کتاب مؤمنین جو اپنی پہلی کتابوں اور انبیاء پر بھی ایمان رکھتے تھے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر بھی ایمان لائے، ان دونوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ یہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی بامراد ہیں۔ ابن عباس اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر منقول ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف وہ مومنین ہیں جو پچھلے انبیاء کی کتابوں کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے یعنی مؤمنین اہل کتاب کہ جب حضور اکرم مبعوث ہوئے تو انھوں نے آپ کی بھی تصدیق کی، جبکہ پہلے ہی سے وہ تمام انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے میری رائے میں دونوں تفسیروں میں بہتر تفسیر ابن عباس اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما کی ہے، یعنی اولٰئك سے اشارہ دونوں جماعتوں کی طرف ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں جماعتوں کی تعریف کی ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ جب دونوں جماعتیں اپنی صفات میں برابر ہیں اور ثناء و تعریف کی مستحق ہیں تو یہاں کسی ایک کی تخصیص کر دی جائے۔ "اولٰئك علیٰ ھدًی من ربھم" کا مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے رب کی طرف سے نور، برہان، استقامت اور مراد حاصل ہے۔ یہ مفہوم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور "اولٰئك ھم المفلحون" یعنی یہی لوگ کامیاب ہیں اور اللہ کے پاس کی خیر و برکات کو حاصل کرنے والے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اولٰئك ھم المفلحون" سے اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے وہ تمام چیزیں پالیں جو انھیں مطلوب تھیں اور جس سے وہ ڈرتے تھے، بھاگتے تھے اس سے محفوظ رہے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں — برابر ہے ان کے حق میں — خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں — وہ ایمان نہ لاویں گے

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ

بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

اور ان کے لیے سزا بڑی ہے

ان سے کوئی امید نہ رکھیے

"ان الذین کفروا"

اس سلسلے میں مفسرین کی رائے مختلف ہے کہ اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ان الذین کفروا کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اگرچہ ان کا دعوٰی یہ ہے کہ آپ سے پہلے جو کچھ نازل ہوا، اس پر وہ ایمان رکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ آیت، یہود مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں دھتکار رہا ہے کہ اس علم کے باوجود کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اور تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں وہ آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، آپ سے یہ بھی

منقول ہے کہ سورۂ بقرہ کی شروع کی ننوّ آیتیں چند مخصوص افراد کے متعلق نازل ہوئی ہیں، آپ نے تفصیل کے ساتھ ان احبار یہود اور قبیلۂ اوس و خزرج کے منافقین کے نام بتائے تھے جن کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں، لیکن ہم نے طوالت کے خوف سے ان ناموں کی تفصیل چھوڑ دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور قول نقل کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ سب لوگ ایمان لائیں اور ہدایت پر آپ کے ساتھ ہو جائیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ ایمان تو صرف وہی لا سکتے ہیں جن کے مقدر میں سعادت لکھی جا چکی ہے، لیکن جن کی تقدیر میں شقاوت ہے وہ ایمان کیسے لا سکتے ہیں! "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ" (بے شک جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کے حق میں یکساں ہے، خواہ انھیں آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لائیں گے) ربیع بن انس نے فرمایا کہ ان الذین کفروا سے لھم عذاب عظیم تک دونوں آیتیں اسلام کے خلاف کافروں کی قیادت کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اسی طبقہ کا ذکر اس آیت میں بھی ہوا ہے "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَہُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَہَنَّمَ یَصْلَوْنَہَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ" (کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کی جگہ میں آتارا، یعنی جہنم میں، جس میں کہ وہ جلائے جائیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے)۔ یہی وہ کفار ہیں جو بدر کی لڑائی میں قتل کر دیئے گئے تھے لیکن سب سے بہتر تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے جو سب سے پہلے ہم نے نقل کی ہے، کیونکہ اس سے پہلی آیتوں میں ذکر مومنین اہل کتاب کا تھا اور ایمان کی وجہ سے ان کی تعریف کی گئی تھی، اب یہیں لگے ہاتھوں اہل کتاب کے کفار کی مذمت بھی کر دی گئی کہ سب کچھ جانتے ہوئے چھپاتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ یہاں کفر کے معنی جحود و انکار کے ہیں، کیونکہ احبار یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا تھا اور اس کے باوجود کہ وہ حضور اکرمؐ کو اسی طرح پہچان گئے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے، لیکن چھپاتے تھے تاکہ کسی کے علم میں نہ آ جائے۔ کلام عرب میں کفر کے معنی چھپانے کے آتے ہیں، اسی وجہ سے رات کو کافر کہتے ہیں، کیونکہ تاریکی اسے بھی چھپائے رکھتی ہے، اسی طرح احبار یہود (یہودیوں کے مذہبی عالموں اور پیشواؤں نے حضور اکرمؐ کی نبوت کو جاننے اور سمجھ لینے کے باوجود چھپائے رکھا۔ "سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون"۔ سواء، کا معنی ہے برابر، تساوی سے ماخوذ ہے، بولتے ہیں "متساو ھذان الامران عندی" یا "ھما عندی سواء" یعنی میرے نزدیک دونوں باتیں برابر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کفار کے لیے دونوں باتیں برابر ہیں، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، بہر حال وہ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگ چکی ہے ءَاَنْذَرْتَہُمْ میں پہلا ہمزہ اَیٌّ کے موقعہ پر آیا ہے، یعنی ظاہر کلام کے اعتبار سے معلوم تو ہوتا ہے استفہام، لیکن ہے خبر۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ" یعنی "ذکر" کے علم کے باوجود ان یہودیوں نے آپ کا انکار کیا اور جو میثاق و عہد ان سے آپ کے بارے میں لیا گیا تھا اسے توڑ دیا، گویا اس طرح انھوں نے آپ کے ساتھ اپنی کتابوں اور اپنے انبیاء کا بھی انکار کیا، اب وہ آپ سے انذار و تحذیر (ڈرانے) کو کس طرح سن سکتے ہیں!

بدبختی ان کی تقدیر بن چکی ہے

"ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم"۔ "ختم" کے اصل معنی مہر لگانا ہے، طابع یعنی مہر۔ چونکہ بندوں کے دل بھی علوم و معارف کے لیے ظرف کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کے لیے بھی ختم کا لفظ استعمال کیا، کان اور دل پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں کے ذریعہ سن کر اور سمجھ کر انبیاء پر ایمان لایا جا سکتا تھا، لیکن اب ان پر مہر لگ چکی ہے۔ دلوں پر مہر کس طرح لگتی ہے؟۔ اس کی تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے کہ دل، ہاتھ کی طرح ہے، جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ہاتھ بند ہوتا ہے، آپ نے کَن انگلی بند کرکے دکھایا کہ یوں، پھر جب دوبارہ گناہ کرتا ہے تو ہاتھ اور بند ہوتا ہے، آپ نے اس مرتبہ اپنی دوسری انگلی بھی بند کرکے

دکھایا، جب پھر گناہ کرتا ہے تو ہاتھ اور بند ہوتا ہے، اس مرتبہ آپ نے اپنی تیسری انگلی سے بند کر کے دکھایا، یوں جب تمام انگلیوں سے ہتھیلی کو بند کر چکے تو فرمایا کہ پھر اس پر مہر لگ جاتی ہے، مجاہد نے فرمایا کہ ہمارے اساتذہ کہتے تھے کہ یہی رین ہے۔ مجاہد سے ایک اور روایت میں ہے کہ رین، طبع (یعنی ختم) سے ہلکا ہے اور طبع، اقفال سے ہلکا ہے۔ اقفال ان سب میں زیادہ مہلک اور شدید ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ختم اللہ علیٰ قلوبھم سے اللہ تعالیٰ نے ان کے تکبر اور حق سننے سے بھی اعراض و انکار کے متعلق بتایا ہے۔ اس سلسلے میں حق میرے نزدیک وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب مؤمن گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے، پھر اگر اس نے توبہ کر لی اور مغفرت کا طلبگار رہا تو اس کا دل دوبارہ صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر گناہ میں آگے بڑھتا رہا تو وہ نقطہ بھی بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور آخر سارے دل پر محیط ہو جاتا ہے، یہی وہ رین ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ" (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے، ان کے اعمال کی وجہ سے)۔ اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ جب بندہ برابر گناہ کرتا رہتا ہے تو سیاہ نقطہ اس کے پورے دل پر محیط ہو جاتا ہے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ اب قبول ایمان کے لئے اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس غیر محسوس طبع و ختم کی مثال کسی برتن کو مہر بند کر دینے کی سی ہے کہ جس طرح ایک برتن کو مہر بند کر دینے کے بعد جب تک اس کی مہر کو پھر سے توڑا نہ جائے، نہ اس میں سے کوئی چیز نکالی جا سکتی ہے اور نہ داخل کی جا سکتی، اسی طرح جب دل پر مہر لگ گئی تو ایمان قبول کرنے کی صلاحیت اس میں سے ختم ہو جاتی ہے، ہاں اگر مہر توڑنے کی کوئی صورت ہے تو پھر قبولیت ایمان بھی ممکن ہے۔ "وَعَلٰی ابصارھم غشاوۃ" یہ مبتدا اور خبر ہے اور غشاوۃ مرفوع ہے عَلٰی اَبْصَارِھِمْ کی وجہ سے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سَمْعِھِمْ مستقل جملہ ہے۔ کلام عرب میں عین و بصر (آنکھ) کی صفت ختم نہیں لاتے، قرآن مجید میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوا اور نہ حدیث میں اس کی کوئی مثال ہے، بلکہ ایک دوسری سورہ میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے "وَخَتَمَ عَلٰی قَلْبِہٖ وَسَمْعِہٖ" (اور اللہ نے مہر لگائی ہے ان کے دل پر اور ان کی شنوائی پر) اور پھر اس کے بعد ہے "وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشَاوَۃً" (اور ان کی آنکھ پر پردہ کر دیا ہے)، یہاں بھی بصر کی صفت ختم نہیں، بلکہ غشاوۃ ہی لائے ہیں۔ غشاوۃ کلام عرب میں پردہ کے معنی میں آتا ہے "تغشانی الھم" اس وقت بولتے ہیں جب غم بہت ہو جائے، غموں کے بادل امنڈ آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے احبار (علماء) یہود کے متعلق بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اب اس کے باوجود کہ وہ خوب جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کسی موعظت و نصیحت کو نہیں سمجھ سکتے، اور ان کی شنوائی پر بھی مہر لگ گئی ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی تحذیر و تنذیر پر کان نہیں دھرتے اور نہ کسی دلیل کو مانتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ ان کی آنکھوں پر بھی پردہ ہے اور وہ ہدایت کے راستے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے دلوں اور شنوائی پر مہر لگ گئی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور جب تک وہ اس حق پر ایمان نہیں لاتے جسے آپ لے کر مبعوث ہوئے ہیں، اس وقت تک وہ قطعاً ہدایت نہیں پا سکتے، خواہ آپ سے پہلے کی تمام کتابوں اور انبیاء پر ایمان کیوں نہ رکھتے ہوں۔ ربیع بن انس سے روایت ہے کہ یہ دونوں آیتیں "ولھم عذاب عظیم" تک کفار کے قائدین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اور یہی وہ تھے جو بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ کفار کے ان لیڈروں میں دو، سفیان بن حرب اور حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہما، کے سوا اور کوئی اسلام نہیں لایا تھا۔ "ولھم عذاب عظیم" ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ ان احبار یہود کو ان کے جھٹلانے اور انکار کرنے کے بدلے میں بڑا عذاب ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور ان لوگوں میں بعضے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں (یعنی محض چالبازی کی راہ سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں) اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ

اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے، انکے دلوں میں بڑا مرض ہے۔ سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے اور ان کے لیے سزا دردناک ہے

بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

منافقین، خودفریبی میں مبتلا

"ومن النّاس من یقول اٰمنا باللہ و بالیوم الاٰخر وماھم بمؤمنین"، تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیتیں اوس وخزرج کے منافقین اور ان کی اتباع کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے، قتادہ، مجاہد اور ربیع بن انس رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔ ابنِ جریج نے فرمایا کہ آیت ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کی بات ان کے عمل کے اور جن کا باطن ان کے ظاہر کے مخالف تھا۔ اصل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہجرت کر کے مقیم ہو گئے، اوس وخزرج کے انصار نے آپ کی مدد کی اور مہاجرین بھی آپ کے ساتھ رہنے لگے تو اسلام کو ایک طاقت وقوت حاصل ہو گئی، اسلام نے مدینہ میں غلبہ حاصل کر لیا تھا اور دوسری تمام طاقتیں مغلوب ہو چکی تھیں اس وقت سب سے پہلے احبارِ یہود کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف بغض وحسد کی آگ بھڑکی اور انھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کے خلاف عام یہودیوں کو ورغلایا، ادھر خود قبیلۂ اوس وخزرج میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو بظاہر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، لیکن کفر ان کے دلوں میں چھپا ہوا تھا۔ جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے آتے تو ایمان و اسلام کا اظہار کرتے، لیکن جب یہودیوں اور دوسرے مشرکوں سے ملتے تو کہتے کہ میاں، ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ کی تکذیب کرتے اور کفریہ کلمات کہتے۔ یہ منافقین کی جماعت تھی اور اسی کا ذکر "ومن الناس من یقول" میں ہوا ہے۔ وما ھم بمؤمنین، یعنی وہ اپنے ایمان کے دعویٰ میں جھوٹے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ جو زبان سے اللہ اور رسول پر ایمان کا اقرار کرتے ہیں، تو یہ محض ان کا نفاق ہے، ان کے حقیقی معتقدات کچھ اور ہیں۔ "یخادعون اللہ والّذین اٰمنوا"، یعنی منافقین جو زبانی اقرار کرتے ہیں اور دل میں شک وتکذیب چھپائے ہوئے ہیں، تاکہ کھل کر تکذیب کی وجہ سے جو نقصانات انھیں پہنچ سکتے تھے اس سے محفوظ رہیں تو یہ محض اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا خداع اور دھوکہ ہے۔ ابن وہب رحمۃ اللہ نے بیان کیا کہ میں نے عبدالرحمٰن بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ منافقین ہیں، یا جو اللہ، اس کے رسول اور مؤمنوں کو اس دھوکہ میں رکھنا چاہتے تھے کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یخادع، مخادعت سے اور مفاعلت کے وزن پر مصدر اور اس کے مشتقات اس وقت استعمال ہوتے

ہیں جب اس فعل کے دو فاعل ہوں، جیسے ضاربت اخاك (میں نے تمہارے بھائی کے ساتھ مار پیٹ کی)، جالست اباك (میں تمہارے والد کے ساتھ بیٹھا) پہلے جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں نے تمہارے بھائی کو مارا اور تمہارے بھائی نے مجھے مارا اور دوسرے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ میں اور تمہارے والد دونوں بیٹھے، یہی یخادعون اللہ میں ہونا چاہئے کہ منافقین نے اللہ کو دھوکہ دیا اور اللہ نے منافقین کو، منافقین کی طرف سے دھوکے کی کوشش کا تو یقیناً تحقق تھا، لیکن اللہ کی طرف سے دھوکے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ بعض اوقات یفاعل، یفعل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اگرچہ اس کا استعمال کلام عرب میں بہت کم ہے لیکن یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں پر بھی یخادع اپنے اصل معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اور خداع (دھوکا) کا تحقق دونوں طرف سے ہے، منافق کا خداع تو یہ ہے کہ بظاہر مسلمانوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسول کا اقرار کرتا ہے، لیکن دل سے جھٹلاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خداع یہ ہے کہ اس نے اسے حسن بصیرت سے محروم کر دیا ہے، وہ اپنے دورخے پن کے نتیجے میں اس صلاحیت سے محروم کردیا گیا جس سے معاد و آخرت کے متعلق کچھ سوچ سکتا تھا، یہی بات اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقعہ پر بھی فرمائی ہے" وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا" (اور ہرگز گمان کریں کافر کہ ہماری مہلت دینا ان کو ان کے حق میں بہتر ہے، ہم تو صرف ان کو اس لئے مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ گناہوں میں بڑھ جائیں) اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ جو معاملہ کرے گا اس کی تھوڑی سی تفصیل اس آیت میں بیان کی گئی ہے" يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ. الآیۃ (اور جس دن منافق مرد اور عورتیں کہیں گی، مومنین سے کہ ہماری طرف دیکھو ہم تمہارے نور ایمان سے روشنی حاصل کریں گے) - وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون یعنی منافقین نے دھوکہ دینے کی کوشش تو بہت کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک وہی خود فریبی میں مبتلا رہے، جیسے" قاتل فلان فلانا فلم یقتل الا نفسہ"، اس وقت بولتے ہیں جب ایک شخص نے دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کی، ادھر دوسرے نے بھی مدافعت کی اور جوابی کارروائی کی، اور پہلا اپنے اس اقدام کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا۔ یہی صورت یہاں بھی ہے کہ منافقین نے اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کی، لیکن اللہ کا حکم غالب ہے چنانچہ وہ خود ہی اپنے دھوکے کا شکار ہوگئے۔ البتہ انہوں نے اس دھوکہ دہی سے جو اس کی کوشش کی تھی کہ ان کا اور ان کے مال و اولاد کا تحفظ ہو جائے اور اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ اپنی دھوکہ دہی میں کامیاب بھی رہے، لیکن حقیقتاً انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، کیونکہ کامیابی اس وقت ہوتی جب اللہ، اس کا رسول اور مسلمان ان کے اس فریب میں آجاتے، لیکن ادھر معاملہ یہ ہے کہ سب کچھ ان کے علم میں ہے اور محض ڈھیل دی جارہی ہے کہ عصیان و نافرمانی جی بھر کے کرلیں، بہت جلد انھیں اس کی پوری پوری سزا ملنے والی ہے، وما یشعرون (یعنی اور لیے سمجھتے بھی نہیں۔ ابن وہب نے بیان کیا کہ میں نے ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے بھی نہیں کہ انھوں نے کفر و نفاق کی اپنے دلوں میں آبیاری کر کے خود کو نقصان پہنچایا ہے، پھر آپ نے آیت وَيَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا (جب اللہ ان سب کو قیامت کے دن اٹھائے گا) سے وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَدْ كَانَ الْإِيمَانُ يَنْفَعُهُمْ (اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ بھی کسی حقیقت پر قائم ہیں، اور ایمان ان کو نفع پہنچاتا) تک پڑھی۔

کھوٹ

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا۔ مرض کے معنی ہیں روگ اور کھوٹ، یہ جسم میں بھی ہوتا ہے اور دین میں بھی، یہاں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ منافقین کے دلوں میں مرض ہے یعنی ایسا مرض جس کا تعلق ان کے اعتقاد سے ہے، یہ مرض وہی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں شک و شبہ، نہ تو انھیں اس کا یقین تھا کہ مومن کہلاتے اور نہ وہ اس کا انکار ہی کرتے تھے کہ مشرکین کی صف میں داخل ہو جاتے، ان کا یہی وصف اللہ تعالیٰ نے اس آیت

میں بیان کیا ہے کہ "مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ" (ان دونوں کے درمیان مذبذب ہیں، نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے) بولتے ہیں فُلَانٌ تُمَرِّضُ فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ یعنی اس معاملہ میں فلاں شخص کا ارادہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ابنِ عباس، ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فی قلوبھم مرض میں مرض سے مراد شک ہے۔ ربیع بن انس نے فرمایا کہ اس مرض کا تعلق جسم سے نہیں، بلکہ ان کے دین میں مرض تھا اور یہ منافقین تھے، قتادہ اور ربیع بن انس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے کہ مرض بمعنی شک ہے۔ فزادھم اللہ مرضًا، یعنی جو مرض اور روگ ان منافقین کے دلوں میں تھا، اللہ نے اسے اور بڑھا دیا ہے کہ جب مزید حدود و فرائض اور آیات کا نزول ہوا تو ان کی حیرانی اور تذبذب میں اسی کے مطابق اور اضافہ ہو گیا جس طرح مومنین کے ایمان میں اس کی وجہ سے اور پختگی اور اضافہ ہوا ہے۔ اس کا بیان دوسری آیات میں وضاحت کے ساتھ ہوا ہے اور آیت کی اس تفسیر پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ ابنِ عباس اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فزادھم اللہ مرضًا سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے شک وشبہ میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فزادھم اللہ مرضًا، یعنی ان کی گندگی میں اور اضافہ کر دیا، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی "فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ" (پس وہ لوگ جو کہ ایمان لائے تو ان کے ایمان تازہ ہو گئے اور وہ اس پر خوش ہیں اور جن کے قلوب میں کجی ہے تو ان کی گندگی میں اور اضافہ ہو گیا) "ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون" "الیم" موجع (تکلیف دہ اور دردناک کے معنی میں ہے۔ الیم یعنی مولم، جیسے وجیع، موجع کے معنی میں اور بدیع، مبدع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ الیم، عذاب کی صفت ہے۔ ربیع اور ضحاک رحمہما اللہ سے یہی منقول ہے کہ الیم، موجع کے معنی میں ہے ضحاک نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں بھی الیم آیا ہے اس کے معنے موجع (تکلیف دہ) ہی ہیں۔ یکذبون کے بارے میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اسے یَکْذِبُوْنَ ذال کی تخفیف اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی وہ جھوٹ کہتے ہیں) کوفہ کے اکثر قاری قرآن علماء نے یہی قرارت اختیار کی ہے، لیکن دوسرے حضرات کی قرارت یُکَذِّبُوْنَ یاء کے ضمہ اور ذال کی تشدید کے ساتھ ہے، مدینہ، حجاز اور بصرہ کے اکثر قاریوں نے یہ قرارت اختیار کی ہے (یعنی وہ جھٹلاتے ہیں تکذیب سے) ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو عذاب الیم کا مستحق قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا کیونکہ صرف جھوٹ بولنے سے عذاب الیم کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان منافقین کا ایک قول نقل کر چکا ہے، کہ جب یہ مسلمانوں کے سامنے ہوتے ہیں تو دھوکہ دینے کے لئے اللہ اور رسول پر اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دل میں ایمان نہیں ہوتا، یہ محض دھوکہ دیتے ہیں، پھر فرمایا کہ "اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، کیونکہ یہ اپنے ایمان کے دعوی میں جھوٹے ہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس موقعہ پر انھیں وعید اسی بنیاد پر ہوگی جو ان کے حالات کے سلسلے میں پہلے سے بیان ہوتا آ رہا ہے، اور چونکہ یہاں ان کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے جھوٹے دعوی کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے ان کے افعال پر جب عذاب دردناک کی وعید سنائی تو اس کی وجہ بھی یہی بتائی کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ایک اور روایت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ" (جب منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں) یہاں پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کا ایک قول نقل کیا جس پر اعتقاد نہیں ہے، لیکن زبان سے کہتے ہیں۔ اس کے بعد اسی آیت میں انھیں عذاب مہین کی وعید دی گئی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس میں وہ جھوٹے ہیں

اسی طرح اس آیت میں بھی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ○

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ○ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا

یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی

كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ

ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لائے ہیں یہ بے وقوف، یاد رکھو بیشک

هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ○

یہی ہیں بے وقوف لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے۔

فساد پھیلانے والے

"وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ" سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس جماعت کے بارے میں آیت "واذا قیل لهم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون" (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ارے ہم تو اصلاح کر رہے ہیں) نازل ہوئی تھی (یعنی منافقین) تو حضور اکرم ص کے بعد پھر مسلمانوں میں اس طرح کے لوگ پیدا نہیں ہوئے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آیت میں خطاب منافقین سے ہے اور فساد فی الارض کا مطلب ہے کفر اور معصیت۔ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت میں جس فساد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، کیونکہ جو شخص زمین پر اللہ کی نافرمانی خود بھی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہے تو وہ زمین میں فساد پھیلاتا ہے، کیونکہ زمین و آسمان کی صلاح، طاعت و عبادت سے قائم ہے۔ آیت کی تفسیر میں بہتر قول یہ ہے کہ یہ آیت نازل تو ہوئی ہے انھیں منافقین کے بارے میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے، لیکن قیامت تک جو شخص بھی اسلام میں اس ارادہ اور نیت سے داخل ہوگا جیسا کہ حضور اکرم ص کے دور کے منافقین داخل ہوئے تھے تو وہ بھی اس آیت کا مصداق ٹھہرے گا۔ ہم نے اس تفسیر کو اس لیئے پسند کیا ہے کہ تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان آیات میں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ حضور اکرم ص کے دور کے منافقین کی ہیں اور یہ کہ اس آیت میں خطاب انھیں منافقین کو ہے۔ زمین میں فساد پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روکا ہے انھیں کرنا اور جن کی حفاظت کا حکم دیا ہے انھیں ضائع کر دینا۔ آدم علیہ السلام کے متعلق ملائکہ کے قول کی اطلاع دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ" (ملائکہ نے کہا، کیا آپ خلیفہ بنائیں گے اس کو جو فساد پھیلائے گا زمین میں اور خونریزی کرے گا) اس آیت میں بھی (زمین میں فساد پھیلانے کا ذکر ہے اور) ملائکہ نے اس سے یہی مراد لیا ہے کہ کیا آپ اس کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیں گے جو آپ کی نافرمانی کرے گا اور آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرے گا، یہی صفت یہاں منافقین کی بیان ہوئی ہے کہ زمین میں اپنے رب کی نافرمانی کرکے، فرائض و واجبات کو ضائع کرکے اور اللہ کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات کے ذریعہ

وہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اور سمجھتے یہ ہیں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے زمین میں اصلاح ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ صرف ان کے سمجھ لینے سے اپنے دردناک عذاب میں، جو ان کے لیے اس نے تیار کر رکھا ہے کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا، وہ دنیا میں بھی رسوا اور ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں دردناک عذاب ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا کہ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (سن رکھو، حقیقتاً یہی لوگ فسادی ہیں اور یہ اس کا بھی احساس نہیں رکھتے)، "قالوا انما نحن مصلحون" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں، ہمارا مقصد تو صرف دونوں فریق یعنی مؤمنین و اہلِ کتاب میں صلح قائم رکھنا ہے۔ لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح نافرمانیاں نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہدایت پر قائم ہیں۔ ان دونوں اقوال میں سے جسے بھی اختیار کیا جائے، بہرحال ان کے جواب "انما نحن مصلحون" سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے تھے اس میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے تھے، اور بہرحال یہ سب اللہ کی نافرمانی اور اس کے دین کی مخالفت ہی میں تھا۔ اس لیے "الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون"، سے منافقین کے دعوی کو اللہ تعالیٰ نے رد کر دیا ہے کہ انکا دعویٰ جھوٹا ہے، یہ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، اگرچہ اس کا بھی احساس نہیں رکھتے۔

نصیحت کا الٹا اثر

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ" سے مراد وہی طبقہ ہے جن کی صفات ابھی "امنا باللہ والیوم الآخر وما ھم بمؤمنین" (وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روزِ آخرت پر، حالانکہ وہ بالکل ہی ایمان والے نہیں ہیں) میں بیان ہوئی ہیں یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح واقعی مؤمنین ایمان لائے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح تصدیق کرو جس طرح حضور اکرم ﷺ کے صحابہ رضؓ نے تصدیق کی، الناس میں الف لام تعریف کا ہے، یعنی کچھ مخصوص لوگ مراد ہیں جو ان منافقین کے لیے اس حیثیت سے جانے پہچانے تھے کہ وہ سچے دل سے ایمان لائے تھے، اور حضور اکرم جن احکام کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے ان کی تصدیق کی تھی۔ "قالوا انؤمن کما آمن السفھاء"، سفہاء جمع ہے سفیہ کی، جیسے علماء، علیم کی، حکماء، حکیم کی جمع ہے۔ سفیہ جاہل، کم عقل، کہ جسے نفع نقصان کی کچھ خبر نہ ہو اور ارادہ کے کمزور شخص کو کہتے ہیں۔ منافقین کو جب اخلاص کے ساتھ ایمان کی دعوت دی جاتی اور کہا جاتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی شریعت پر ایمان لاؤ اور آخرت کے دن کی تصدیق اس طرح کرو جیسے حضور اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضؓ نے ان امور کی تصدیق کی ہے تو وہ جواب دیتے، کیا ہم بھی ایمان لائیں، جیسے یہ بے عقل اور بے شعور لوگ ایمان لائے ہیں۔ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع بن انس اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے کہ منافقین کا اشارہ صحابہ رضؓ کی طرف تھا "الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون"، یعنی منافقین ہی جاہل ہیں اپنے دین کے بارے میں، اور اپنے معتقدات میں کمزور ہیں کہ اللہ، اس کے رسول، وحی اور بعث وحشر کے بارے میں شک وشبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "الا انھم ھم السفھاء"، یعنی جاہل یہی ہیں، "ولکن لا یعلمون"، لیکن وہ عقل نہیں رکھتے"۔ اس آیت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ علم کے باوجود صرف اللہ کے ساتھ عناد کی وجہ سے کفر کرنے والے کے ساتھ ہی عذاب مخصوص نہیں ہے، بلکہ جو بھی اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور وحی کی تصدیق نہیں کرتا، وہ اس عذاب کا مستحق ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ ۙ قَالُوْٓا

اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں

إِنَّا مَعَكُمْ ۙ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ۝ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ

ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں — اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں انکے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو

فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ص

کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں — یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی ہے بجائے ہدایت کے

فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے

دُوْرُخَاپَن

”وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ“ یہ آیت، سابقہ آیت ”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ“ کی طرح ہے وہاں بھی فوراً ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تردید کردی تھی کہ ”حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں“۔ ”وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ“ بلکہ اس زبانی اقرار سے ان کا مقصد محض فریب اور دھوکا ہے اسی طرح یہاں بتایا ہے کہ یہ منافقین جب سچے مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن جب اپنے بدباطن، سرکش اور کفر کرنے والے ساتھیوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میاں، ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، تمہارے دین پر ہیں اور تمہارے مخالفوں کے مقابلے میں تمہاری صف میں ہیں، ہم تو صرف اللہ، اس کی کتاب اور رسول اور ان کے ساتھیوں کو بنا رہے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ یہودی تھے جو صحابہ رضؓ سے ملتے تو کہتے کہ ہم نے تمہارا دین قبول کر لیا ہے، لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے تو کہتے کہ ہم تو صرف بنا رہے تھے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اذا خلوا الی شیاطینہم میں شیاطین سے مراد کفر میں ان کے سردار ہیں۔ قتادہ سے روایت ہے کہ شر و فساد پھیلانے میں جو ان کے قائد تھے وہ مراد ہیں۔ مجاہد سے روایت ہے کہ مطلب یہ ہے، جب منافقین اپنے کافر ساتھیوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں، ان سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیاطین سے مراد منافقین اور مشرکین دونوں ہیں جو ان کے ساتھی تھے۔ ”خلوت الی فُلانٍ“ اس وقت بولتے ہیں جب کسی خاص ضرورت کے لیے کوئی شخص کسی کے پاس اکیلا ہو۔ ایک استعمال اس کا خلوت بفلان بھی آتا ہے، لیکن اس میں دو معنی تھے، اس لیے اس کے باوجود کہ بآ کے صلہ کے ساتھ خلا کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، یہاں الی کے ساتھ استعمال کیا تاکہ مفہوم میں کسی قسم کا التباس باقی نہ رہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ خلوا الی شیاطینہم میں الیٰ، مع کے معنی میں ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے کہ ”إِذْ قَالَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ“ (جب حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حواریین سے کہا کہ کون میرا مددگار ہوتا ہے اللہ کے ساتھ) یہاں بھی الی، مع کے معنی میں آیا ہے۔ بعض کوفہ کے نحویوں نے کہا ہے کہ واذا خلوا الی شیاطینھم ”کا مفہوم“ وَإِذَا صرفوا اخلاءھم الی شیاطینھم“ (یعنی جب اپنے دوست شیاطین کے پاس جاتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر الی کا ایک خاص استعمال ہوا ہے اور وہی کلام کے مفہوم کا تقاضا بھی تھا یعنی یہ بتانا کہ منافقین جب مؤمنین سے ملنے کے بعد اپنے شیاطین کے پاس اکیلے ہوتے ہیں۔ اس توجیہ کے مطابق یہاں الی کے سوا اور کوئی لفظ اگر لایا جاتا تو مفہوم ہی خراب ہو جاتا، میرے خیال میں یہی توجیہ سب سے زیادہ مناسب ہے ”إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ“ تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کے معنی ہیں ”انما نحن ساخرون“ (یعنی ہم ان کا مذاق بنا رہے تھے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”انما نحن مستھزؤن“ یعنی ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا مذاق بنا رہے تھے۔ قتادہ اور ربیع بن انس رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔

اللہ کا مذاق

"اللہ یستھزئ بھم" (انھیں اللہ بنا رہا ہے) منافقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے استہزاء (مذاق کرنا، بنانا) کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت کی طرف خود قرآن مجید میں اشارہ کردیا ہے، قیامت کے ذکر کے سلسلے میں ارشاد ہوا ہے "یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ" (جس دن کہ منافق مرد اور منافق عورتیں مؤمنوں سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو، ہم تمہارے نور ایمان سے روشنی حاصل کریں)، تو اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے مڑ کر نور تلاش کرو، جب وہ پیچھے مڑیں گے تو ان کے سامنے ایک چہار دیواری کھڑی کردی جائے گی، اس میں ایک دروازہ ہوگا، اندر تو اس کے رحمت ہوگی اور سامنے عذاب ان کا استقبال کرے گا، اس وقت وہ پھر پکاریں گے، کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ مسلمان جواب دیں گے کہ ہاں، ساتھ تو تم ہمارے ہی تھے، لیکن تمہارے پیش نظر فتنہ تھا۔ اسی طرح ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا" (کفار یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو انھیں ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے حق میں مفید ہے، ہم تو انھیں محض اس لیئے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ وہ گناہ میں اور بڑھ جائیں) یہ اور اس طرح کی دوسری آیتیں جن میں منافقین کو خطاب کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ استہزاء کی صورتوں کو متعین کرتی ہیں۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے استہزاء سے مراد ہے توبیخ، زجر اور ملامت اور ان کی ہلاکت و بربادی، یہ صورت بھی اس میں داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ شروع میں تو انھیں ڈھیل دیتا رہے اور پھر، جب وہ بالکل غافل ہوجائیں اور اپنے متعلق کسی قسم کا خوف و خطرہ انھیں باقی نہ رہے تو اچانک اس کی بطش نازل ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی اپنے لیئے مکر، خدیعہ اور سخریہ کے الفاظ استعمال کیئے ہیں وہاں اس کا مفہوم یہی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "اللہ یستھزئ بھم" (انھیں اللہ بنا رہا ہے) صرف ان منافقین کے جواب کے طور پر کہا گیا ہے جو اپنے ساتھیوں سے اکیلے میں کہتے تھے کہ "انما نحن مستھزؤن" (ہم تو صرف انھیں بنا رہے تھے) یہی صورت "مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰهُ" (انہوں نے خفیہ تدابیر کیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدابیر کیں) یا "یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ" (اللہ اور مسلمانوں سے وہ دھوکا کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود اپنے کو دھوکا دے رہے ہیں) میں بھی ہے کہ محض ان کے جواب کے لیئے اللہ تعالیٰ نے مکر، استہزاء وغیرہ الفاظ کی اپنی طرف نسبت کی ہے، اسی کا مفہوم ہے خود اپنے دام میں صیاد کا آجانا یا خود فریبی، ایک آدمی جس نے ایسے شخص کو دھوکا دینے کی کوشش کی جو اس کے دھوکے میں نہ آسکا، اور پھر اس کے جواب میں جب اس نے اقدام کیا اور اس پر قابو پالیا تو اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ آج تم میرے فریب کا شکار ہو، حالانکہ اس نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا تھا جس میں دھوکے کی کوئی شکل رہی ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان مواقع پر اپنے متعلق ان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ذریعہ ان کے مخاطبین کو وعید کی ہے کہ اللہ تمہیں تمہارے اس استہزاء، مکر اور دھوکے کا بدلہ ضرور دے گا۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ کی طرف ان الفاظ کی نسبت کی صورت میں ان کا مفہوم دوسرا ہے اور منافقین و مشرکین کی طرف نسبت کے وقت وہ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہیں۔ قرآن مجید میں خود آیا ہے "جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی کی صورت میں ملے گا)، ظاہر ہے کہ یہاں انسان کی طرف سیئۃ (برائی) کی نسبت اس کے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ہے اور معصیت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت مجازاً ہوئی ہے اور اس کی طرف سے یہ عین تقاضاء عدل و انصاف ہے۔ دونوں کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی اس طرح کے الفاظ اللہ کی طرف منسوب ہوکر استعمال ہوئے ہیں، ان سب کا یہی مفہوم ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ جب وہ اپنے شیاطین کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں، مسلمانوں کے سامنے ان کی جیسی باتیں تو ہم صرف انھیں بنانے کے لیئے کرتے ہیں ویسے ہمیں یقین یہی ہے کہ مسلمان باطل پر ہیں، ہدایت و حق سے ان کا کیا تعلق! استہزاء کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بھی

جو ان کے مقابلے میں اپنی طرف استہزار کی نسبت کی ہے تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ جس طرح منافقین نے ایک بات اپنے دل میں چھپائے رکھی اور ظاہر اس کے خلاف کیا، اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ان کے ساتھ یوں ہی دو رُخا ہے، دُنیا میں انھیں واقعی وہی رعایتیں حاصل ہیں جو مخلص مسلمانوں کو ہیں، لیکن آخرت میں ان کا حشر خدا کے دشمنوں کے ساتھ ہوگا اور اس وقت انھیں اپنے نفاق کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ہمارے نزدیک درست تفسیر یہ ہے کہ کلام عرب میں استہزار کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ استہزار کرنے والا اس شخص کے سامنے جس سے وہ استہزار کر رہا ہے ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جو بظاہر اس کے موافق ہو، لیکن اندر سے مضرت رساں اور نقصان دہ ہو، یہاں جن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے انھوں نے بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا کہ ظاہر میں تو مسلمان تھے، لیکن اندر سے اسلام کی جڑ کھود رہے تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی انھیں دنیا میں مخلص مسلمانوں کی طرح اسلام سے پہنچنے والے دنیاوی فائدوں اور رعایتوں میں برابر کا شریک رکھا، لیکن آخرت میں ان کے ساتھ اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا اور وہاں انھیں دردناک عذاب ملے گا۔

آیت کی اس طرح تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ "ویمدھم فی طغیانھم یعمھون" ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یمدھم کا مفہوم ہے "انھیں ڈھیل دیتا ہے"۔ مجاہد سے روایت ہے کہ یمدھم کا مطلب ہے "انھیں بڑھاتا ہے"۔ یونس حربی سے روایت ہے کہ شر اور برائی میں اضافہ کے لیے مَدَّ استعمال ہوتا ہے اور خیر میں آگے بڑھنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے لیے اَمَدَّ استعمال ہوتا ہے۔ کوفہ کے بعض نحویوں کا خیال تھا کہ جو زیادتی کسی چیز میں خود سے ہو جائے اس کے لیے مَدَّ بغیر ہمزہ کے استعمال ہوتا ہے جیسے مدت النھر وغیرہ لیکن جو زیادتی کسی دوسرے کے عمل کی وجہ سے پیدا ہو اس کے لیے الف کے ساتھ اَمَدَّ استعمال کرتے ہیں، جیسے "اَمَدَّ الجُرحُ، اَمَدَّتِ الجَیْشُ"، بہتر تفسیر اس لفظ کی یہی ہے کہ یمدھم کو "انھیں بڑھاتا ہے"، کے معنی میں لیا جائے، مفہوم اس کا بھی یہی ہوگا کہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور سرکشی اور نافرمانی میں بڑھنے کے لیے انھیں چھوڑ دیتا ہے۔ "فِی طُغْیَانِہِمْ" میں طغیان، فُعْلَانٌ کے وزن پر ہے، اور طَغٰی فلان یطغی طغیانًا سے مشتق ہے، اس کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنی حد سے بڑھ جائے "کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی" (ہرگز نہیں، انسان ضرور سرکشی کرے گا، اگر دیکھے خود کو غنی) یہاں بھی لیطغی کے معنی ہیں "حد سے تجاوز کرے گا"، ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے کہ فی طغیانھم کا مطلب ہے فی کفرھم (یعنی اپنے کفر میں)، قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ مطلب ہے فی ضلالتھم (اپنی گمراہی میں)۔ یعمھون، عَمَہٌ (سے مشتق ہے) اور اس کے معنی خود گمراہی کے آتے ہیں، بولتے ہیں، عَمَہَ فُلَانٌ، یعمہ، عمھانا وعموھا، جب کوئی گمراہ ہو جائے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ اپنی گمراہی اور کفر میں، جس نے ان کے دل و دماغ کو گندے اور کفریہ خیالات کی آماجگاہ بنایا ہے اور جس نے ان سے سوچنے اور سمجھنے کی طاقت چھین لی ہے، سرگرداں اور حیران ہو رہے ہیں اور انھیں اس سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یعمھون کا مفہوم ہے "وہ اپنے کفر میں بڑھتے جا رہے ہیں"، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یعمھون کا مفہوم ہے کہ وہ سرگرداں ہیں۔

گھاٹے کی تجارت

"اولئک الذین اشتروا الضللۃ بالھدیٰ"، ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں منقول ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی اختیار کی اور ہدایت کو چھوڑ دیا، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ "اشتروا الضللۃ بالھدیٰ"، کا مفہوم ہے "انھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی"۔ اشتراء (خریدنے) کا مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز حاصل کرنے کے لیے انسان اس کے بدلے میں دوسری چیز (قیمت کے طور پر) دیتا ہے، آیت کا سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ منافقین نے گمراہی، ہدایت کے بدلے میں خریدی۔ ظاہر ہے کہ منافقین کبھی ایمان نہیں لائے تھے اور اس لیے انھیں ہدایت بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی

اس لیئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہدایت ان کے پاس تھی ہی نہیں تو انہوں نے اسے گمراہی کے بدلے کے طور پر دیا کس طرح؟ آیت میں اس جملہ کا مفہوم کیا بنے گا؟ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی بنیاد پر یعنی اس ترجمہ کی بنیاد پر کہ "انہوں نے گمراہی اختیار کرلی اور ہدایت چھوڑ دی"۔ "اشتراء" کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس میں بھی خریدنے والا ایک چیز چھوڑ جاتا ہے اور اس کے بجائے دوسری چیز لے لیتا ہے، اسی طرح منافقین اور کفار نے بھی ایمان چھوڑ دیا اور کفر لے لیا کہ اگر وہ چاہتے تو ہدایت بھی انھیں حاصل تھی) جن مفسرین نے یہ مفہوم بتایا ہے کہ "انہوں نے گمراہی پر ہدایت کو ترجیح دی"، ان کے پیش نظر کفار ہی کے متعلق ایک دوسری آیت رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کے متعلق فرمایا ہے "اَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى" (ہم نے قوم ثمود کو سیدھا راستہ دکھایا، لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی)۔ ان کے نزدیک دونوں آیتوں کا مفہوم ایک ہے، صرف الفاظ کا فرق ہے۔ اگرچہ یہ بھی آیت کی ایک توجیہ ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ زیادہ مناسب نہیں، کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "فما ربحت تجارتهم" (یعنی ان کی تجارت سودمند نہ ہوئی)، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراء یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اور اسی لیئے میں سمجھتا ہوں کہ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی تفسیر ہی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ کفر بھی انسان خود اختیار کرتا ہے، خود بخود لگ جانے والی چیز یہ نہیں ہے، اس میں بھی انسان کے کسب وعمل کو دخل ہے، دوسری طرف ہر شخص کو ایمان کا حکم دیا گیا ہے اور وہ ایمان لانے کے لیئے مکلف ہے، اس لیئے اگر وہ اسے چھوڑ کر کفر اختیار کرتا ہے تو گویا وہ ایمان کو بدلے میں دے کر کفر کو خریدتا ہے۔ "فما ربحت تجارتهم وما كانوا مهتدين" مطلب یہ ہے کہ منافقین نے جو ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدی اس میں وہ نفع میں نہیں رہے، اس لیئے کہ قیمت دے کر جب ایک شخص کوئی سامان خریدتا ہے تو مقصد یہی ہوتا ہے کہ سامان،...... قیمت کے مقابلے میں اس کے لیئے زیادہ نفع بخش اور مناسب ہے لیکن اگر قیمت تو افضل ہو اور اس سے جو چیز...... خریدی جارہی ہے وہی گھٹیا درجہ کی ہو تو ظاہر ہے کہ یہ خسارے کی تجارت ہوگی یہاں منافقین اور کفار کا بھی یہی حال ہے، اس لیئے کہ انھوں نے سرگردانی اور کورچشمی کو ہدایت وراہ یابی کے بدلے میں اور خوف و رعب کو حفظ وامن کے بدلے میں خریدا ہے، یہ چیزیں وہ ہیں جو دنیاوی زندگی میں بھی ان کے لیئے نقصان دہ ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیئے آخرت میں جو عذاب الیم تیار کر رکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ان کی نامرادی اور خسران کا باعث ہے۔ اسی طرح کی تفسیر قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ سب جانتے ہیں کہ ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے گمراہی اختیار کی تھی، جماعت کو چھوڑ کر الگ ہوگئے تھے، امن کے بدلے میں انہوں نے خوف کو پسند کیا تھا اور اسلام کے صحیح راستے کو چھوڑ کر اپنی من مانی راہ اختیار کی تھی۔ چونکہ قرآن مجید کے اول مخاطب عرب تھے، اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں گفتگو اور خطاب میں ان کے تصورات اور ان کے فہم کی رعایت ہر موقعہ پر کی ہے۔ یہاں بتانا صرف ان کے نقصان اور نامرادی کو تھا، اور عربوں کے انداز میں تجارت کی تمثیل اس موقعہ پر موزوں تر تھی۔ وما كانوا مهتدين، یعنی ہدایت کے بدلہ میں گمراہی اختیار کرکے اور تصدیق وایمان کو چھوڑ کر نفاق کا راستہ اختیار کرکے وہ صحیح راستہ نہ پاسکے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ

ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کردیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گردا گرد کی سب چیزوں کو

بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے سلب کرلیا ہو ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں

فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے۔

منافقین، مثال کے آئینے میں

"مثلهم کمثل الذی استوقد نارًا فلما اضاءت ماحولہٗ ذهب الله بنورهم وترکهم فی ظلمات لا یبصرون" الذی واحد کے لیۓ استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں جماعتِ منافقین کی تمثیل میں ہوا ہے، اگرچہ بظاہر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جماعت کے لیۓ جمع کا صیغہ استعمال ہونا چاہیۓ تھا، لیکن کلامِ عرب میں، خصوصًا تمثیل کے مواقع پر اس طرح کے استعمال بکثرت موجود ہیں اور محاورہ کی ایک بلیغ صورت سمجھی جاتی رہی ہے۔ خود قرآن مجید میں کئی جگہ اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین نے اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان تمام امور پر جنھیں لے کر آپ مبعوث ہوئے ہیں، کا اگرچہ اقرار کیا ہے، لیکن دل سے ان کو جھوٹا سمجھتے ہیں تو ان کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو آگ جلا کر روشنی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پھر روشنی حاصل کرنے والے شخص کا ذکر یہیں چھوڑ کر، خطاب منافقین سے ہوگیا ہے اور اس لیۓ بعد میں پھر جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا، کیونکہ مثال کا جو حصہ بیان کیا گیا تھا اس سے بات واضح ہوگئی تھی۔ اس موقعہ پر اس کا خیال رہے کہ جب بہت سے اشخاص کے کام کی نوعیت یکساں ہو تو اس کی تشبیہ کسی ایک شخص کے کام سے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوسکتا اور یہی صورت اس آیت میں بھی ہے۔ اس آیت کی تفسیر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے، خود ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کئی اقوال مروی ہیں۔ آپ کا ایک قول یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مثال بیان کی ہے اور مطلب اس تمثیل سے یہ ہے کہ وہ حق کو دیکھتے بھی ہیں اور اس کا اقرار بھی کرتے ہیں، لیکن جب وہ حق کو لے کر باہر آتے ہیں تو ان کے کفر و نفاق کی تاریکی اسے بجھا دیتی ہے اور پھر وہ اس کی تاریکی میں اس طرح گھر کر رہ جاتے ہیں کہ نہ ہدایت انھیں نظر آتی اور نہ حق پر انھیں استقامت نصیب ہوتی۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی مثال بیان کی ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اسلام کا زبانی اقرار کر کے دنیا میں عزت حاصل کر لیتے ہیں، مسلمانوں میں شادی بیاہ بھی کرتے ہیں، ان کی وراثت کے بھی حق دار ہوتے ہیں اور فَیٔ اور مالِ غنیمت کی جب تقسیم ہوتی ہے تو اس میں سے بھی انھیں حصہ ملتا ہے، لیکن جوں ہی اس دنیا سے ان کا تعلق ختم ہوا اور وہ مر گئے تو اللہ تعالیٰ ان کی یہ تمام عزت اور سارے حقوق ختم کر دیتا ہے، جس طرح اس نے آگ جلانے والے کی روشنی ختم کر دی تھی اور ترکهم فی ظلمات (اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیتا ہے) کا مطلب یہ لیا کہ انھیں مرنے کے بعد عذاب میں چھوڑ دیتا ہے۔ تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو کچھ ایسے لوگ بھی اسلام میں داخل ہو گئے تھے جنھوں نے بعد میں نفاق کیا، انھیں لوگوں کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو پہلے تاریکی میں تھا، پھر اس نے آگ روشن کی اور جب اس کے چاروں طرف آگ کی روشنی ہوگئی اور وہ اپنے ماحول کی گندگی اور ناپاکی کو دیکھنے کے قابل ہوگیا، اب وہ ان چیزوں کو پہچان سکتا تھا جن سے اسے بچنا چاہیۓ تھا، لیکن اسی وقت اس کی آگ بجھ گئی اور پھر وہ کچھ تمیز نہ کر سکا کہ کس چیز سے بچنا چاہیۓ اور کس سے نہیں۔ یہی حال منافق کا ہے کہ وہ پہلے شرک و کفر کی تاریکی میں تھا، پھر اسلام لایا اور حلال و حرام اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کے قابل ہوا، لیکن کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ پھر کفر اختیار کر لیا، اب نہ اسے خیر کی تمیز رہی نہ شر کی، نہ حلال کی اور نہ حرام کی۔ آیت میں نور سے مراد آں حضورؐ اور آپ کی شریعت پر ایمان ہے اور ان کا نفاق تاریکی اور ظلمت ہے۔ ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ نور سے مراد منافقین کا زبانی ایمان ہے، اور تاریکی سے مراد ان کی گمراہی اور کفر ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد پھر اس سے ہٹ گئے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ منافقین کے کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کے زبانی اقرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دنیا روشن ہوگئی، انھیں مسلمانوں میں شادی بیاہ اور وراثت کا حق حاصل ہوگیا اور اسی کلمہ کے نتیجے میں ان کی جان و مال

بھی محفوظ ہوگئے لیکن جب موت کا وقت آیا تو یہ تمام حقوق ختم کر دیئے گئے، کیونکہ حقیقتاً ان کا اقرار بے بنیاد تھا۔ ضحاک بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نور سے مراد ان کا ایمان ہے جس کا وہ زبانی اقرار کرتے تھے، اور ظلمات (تاریکیوں) سے ان کی گمراہی اور ان کے کفر کی طرف اشارہ ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ آگ روشن ہونے سے مراد ہدایت اور مسلمانوں کی طرف ان کا آنا ہے اور اس کی روشنی کے ختم ہونے سے مراد گمراہی اور کافروں سے مل جانا ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آگ جب جلائی جائے گی تو اس سے نور پیدا ہوگا اور جب بجھادی جائے گی تو اس کی روشنی بھی ختم ہو جائے گی، اسی طرح منافقین کا حال تھا کہ جب وہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تصدیق کرتے تو اس سے ان کے لیئے روشنی پیدا ہو جاتی تھی، لیکن جب شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگتے تو تاریکی میں پڑ جاتے تھے۔ میرے نزدیک ان تمام اقوال میں بہتر قول قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ کا ہے، اور یہی ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اطلاع دی ہے کہ قیامت کے دن وہ منافقین کے راز طشت از بام کر دے گا اور نور اور روشنی ان سے چھین لیگا اس وقت وہ قیامت کی ہولناکیوں میں سرگرداں پھریں گے اور انھیں کچھ نظر نہ آئے گا "صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" میں بھی ان کی اسی بے بہرگی کو بتایا گیا ہے۔ آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیئے اسے "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی" سے پہلے رکھنا پڑے گا، مطلب اس طرح ہوگا" یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی خرید لی ہے، لیکن نہ ان کی تجارت ہی سودمند رہی اور نہ وہ راہ یاب ہوئے، یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب وہ واپس نہ ہوں گے، ان کی مثال تو اس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب آگ نے اپنے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں" صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ" یعنی ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدنے کی وجہ سے یہ منافقین حق وہدایت کی طرف سے بہرے ہوگئے ہیں کہ اسے سن نہیں سکتے۔ گونگے ہوگئے ہیں کہ وہ ان کی زبان پر نہیں آسکتا اور اندھے ہو گئے ہیں کہ نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے، ان کے نفاق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔ ابن عباس اور ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما سے اسی طرح آیت کی تفسیر منقول ہے فھم لا یرجعون انھیں منافقین کے بارے میں اطلاع دی جارہی ہے کہ اب وہ اپنی گمراہی اور نفاق سے واپس نہ ہوں گے، انھوں نے اپنے اوپر توبہ کے تمام دروازے بند کر لیئے ہیں، توبہ اور اللہ ورسول کی طرف واپس آنے کے سلسلے میں اسی طرح کی نا امیدی کی اطلاع اس سے پہلے مشرکین اور اہل کتاب کے رہنماؤں کے متعلق بھی دی جاچکی ہے۔ ابنِ عباس، ابنِ مسعود اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی روایت ہے کہ وہ اسلام وایمان کی طرف نہیں واپس آئیں گے۔

اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

یا اُن منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد وبرق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ

فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ۝ یَكَادُ

ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لیئے ہوئے ہیں کافروں کو برق کی یہ

الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙۗ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ

حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اُس نے لی جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب اُن پر تاریکی ہوئی

قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو اُن کے گوش وچشم سب سلب کر لیتے بلاشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

ایک اور تمثیل

"اوکصیب من السَّمَاءِ" صَیِّبٌ، فعیل کے وزن پر ہے، اور صاب المطر یصوب صوبًا سے مشتق ہے، اس وقت بولتے ہیں جب بارش ہونے لگے، ابنِ مسعود، ابنِ عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے کہ صیب سے مراد بارش ہے۔ قتادہ، مجاہد، ربیع بن انس، عبدالرحمٰن بن زید اور عطاء رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ یعنی اسلام کا زبانی اقرار اور دل میں کفر چھپائے رکھنے والے منافقین کی مثال اس آگ جلانے والے کی سی ہے جو شروع میں اگرچہ اپنے ماحول کو روشن کرلیتا ہے، لیکن پھر اس کی یہ روشنی چھین لی جاتی ہے۔ یا پھر ان کی مثال اس بارش کی سی ہے جس میں تاریکی ہو کہ اس کی بوندیں آسمان پر سے جب گرتی ہیں تو ایک بھیانک منظر پیدا کرتی ہیں، یہی وہ تاریکی ہے جس میں یہ منافقین سرگرداں ہیں۔ ظلمات جمع ہے، اس کا واحد ظلمۃ ہے (بمعنی تاریکی) "فیہ ظلمات و رعد و برق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہ و اذا اظلم علیھم قاموا" رعد کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ رعد وہ فرشتہ ہے جو بادلوں کو ڈانٹتا ہے۔ شہر بن حوشب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر نگراں ہے اور جس طرح حُدی خواں اونٹوں کو ہانکتا ہے، یہ فرشتہ بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے ہوئے بادلوں کو آگے کی طرف لے چلتا ہے، لیکن جب کوئی بادل غلط راستہ اختیار کرتا ہے تو فرشتہ اسے ڈانٹتا ہے، ایسے اوقات میں، اگر فرشتہ بہت زیادہ غصہ ہوگیا تو اس کے منہ سے آگ برسنے لگتی ہے، اور یہی وہ بجلیاں ہیں جنھیں آسمان پر تڑپتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رعد اس فرشتہ کا نام ہے جس کی آواز ہم بادلوں میں سے سنتے ہیں، سبحان اللہ اور اللہ اکبر سے وہ بادلوں کو ڈانٹتا ہے، جب اس کی ڈانٹ ڈپٹ میں سختی آجاتی ہے تو بادل بل کھانے لگتے ہیں اور اسی وقت ان میں سے بجلیاں کوندتی ہیں۔ عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح کے اقوال مروی ہیں۔

رَعد کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ ہوا ہے جو بادلوں کے نیچے سے دبتی اور بھنچتی ہوئی اوپر چڑھتی ہے اور اسی سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ تفسیر بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ برق کی تفسیر بھی مختلف اقوال سے کی گئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ برق وہ کوڑے ہیں جو فرشتوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں اور جن سے وہ بادلوں کو ہانکتے ہیں۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رعد فرشتہ ہے اور برق وہ ضرب ہے جو اپنے لوہے کے کوڑے سے فرشتہ بادل پر لگاتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ برق سے مراد پانی ہے۔ (ان کے علاوہ اور دوسرے اقوال بھی نقل ہوئے ہیں اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے مذکورہ اقوال کے قریب ہیں)۔ آیت کے مفہوم کے سلسلے میں بھی مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ خود ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کئی اقوال اس کی تفسیر میں منقول ہیں۔ ایک تفسیر آپ سے یہ منقول ہے کہ اپنے کفر کی وجہ سے وہ اندھیروں میں ہیں۔ ادھر اپنے مخالفین سے انھیں اپنی جان کا بھی ہر وقت خطرہ رہتا ہے اور مسلمانوں سے بھی ڈرتے رہتے ہیں، جیسے ایک شخص جو بارش کے اندھیرے میں گھر گیا ہو کہ جب بجلی کڑکتی ہے تو موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتا ہے "قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے جائے"، یعنی حق کے نور اور روشنی کی شدت کی وجہ سے، "وہ جب ان پر چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے ہیں اور جہاں ان پر اندھیرا ہوا تو بس کھڑے رہ جاتے ہیں"، مطلب یہ ہے کہ وہ حق کو پہچانتے ہیں اور زبانی اس کا اقرار بھی کرتے ہیں، گویا اقرار کی حد تک تو وہ استقامت ہی پر معلوم ہوتے ہیں، لیکن کفر کے ارتکاب کے بعد حیران و سرگرداں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ دوسری تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے، اور یہی ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی منقول ہے، یہ ہے کہ صَیِّب اور مَطَر مدینہ کے منافقین میں دو اشخاص کے نام تھے یہ مشرکین کے پاس جانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے بھاگ گئے تھے، راستے میں شدید بارش اور طوفان نے انھیں آلیا اور اسی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے کہ اس میں اندھیرا، گرج اور بجلی تھی، اس وقت ان دونوں کا حال یہ تھا کہ جب آسمان گرجتا تو ڈر کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، اور جوں ہی بجلی کی چمک پیدا ہوتی تو اس کی روشنی میں چلنے کی کوشش کرتے

لیکن بہت جلد وہ روشنی ختم ہوجاتی اور انھیں کچھ نہ دکھائی دیتا اور اپنی جگہ پر کھڑے رہ جاتے، آخر وہ دونوں کہنے لگے کہ کاش! صبح جلدی ہوجاتی اور ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کے ہاتھ پر توبہ کرلیتے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صدق دل سے اسلام لائے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دونوں کی مثال، ان منافقین کو مخاطب کرکے بیان کی ہے جو مدینہ میں رہتے تھے۔ مدینہ کے منافقین بھی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے رکھتے تھے، انھیں ہر وقت اس کا خوف رہتا تھا کہ کہیں ان کے بارے میں وحی نہ نازل ہوجائے یا پھر کہیں ان کا کوئی راز نہ کھل جائے اور اس کی سزا میں وہ قتل کردیئے جائیں، جیسے یہ دونوں منافقین جو مدینہ سے بھاگ گئے تھے اور خوف کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلی ٹھونسے رہتے تھے۔ "کلما اضاء لھم مشوا فیہ" (بجلی جب ان پر چمکتی تو یہ اس کی روشنی میں چلتے) یعنی جب ان کے ذاتی مال اور نرینہ اولاد میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے اور فتح اور مالِ غنیمت حاصل ہوتا تو پھر یہ مسلمانوں کے ساتھ چلنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ واقعی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین سچا دین ہے (مال اور دنیاوی منافع حاصل کرکے) وہ استقامت پر ہوتے ہیں۔ جیسے مدینہ سے بھاگنے والے یہ دونوں منافقین کہ جب بجلی ان پر چمکتی تھی تو اس کی روشنی میں چلنے لگتے تھے اور جہاں اندھیرا ہوا، بس کھڑے رہ جاتے تھے، اور جب ان کی دولت و مال گھٹنے لگتا یا ان کے یہاں لڑکیاں پیدا ہونے لگتیں تو کہتے کہ ساری مصیبتیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین نے پیدا کی ہیں اور پھر کفر کرنے لگتے۔ یہی حال ان دونوں منافقین کا بھی تھا کہ جب اندھیرا ہوجاتا تو کھڑے ہوجاتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تیسری تفسیر اس آیت کی یہ منقول ہے کہ کتاب اللہ کا جو زبانی اقرار کرتے ہیں اور لوگوں کے دکھانے کے لیے عمل کرتے ہیں تو یہ گویا ان کے لیے روشنی ہے، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو اس کے خلاف (کافرانہ اور مشرکانہ) اعمال کرتے ہیں، اور یہی وہ تاریکی ہے جس میں وہ حیران و سرگرداں کھڑے ہیں، ظلمات سے مراد گمراہی ہے اور برق سے مراد ایمان ہے۔ چوتھی تفسیر آپ سے یہ منقول ہے کہ یکاد البرق یخطف ابصارھم (قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے) یعنی قریب ہے کہ قرآن کی محکم آیتیں منافقین کے سربستہ راز کھول دیں، کلما اضاء لھم مشوا فیہ (وہ جب ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں یہ چلتے ہیں) یعنی جب تک منافقین کو اسلام کی وجہ سے عزت حاصل ہوتی رہتی ہے تو مطمئن رہتے ہیں، لیکن اگر کہیں کوئی نقصان دکھائی دیا تو کہتے ہیں کہ بس کفر ہی اختیار کرنا چاہیئے، واذا اظلم علیھم قاموا (اور جہاں ان پر اندھیرا ہوا بس کھڑے رہ جاتے ہیں)، جیسے ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ" (اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی پرستش کنارہ پر (کھڑے ہوکر) کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی نفع پہنچ گیا تو وہ اس پر جما رہا اور اگر کہیں اس پر کوئی آزمائش آپڑی تو وہ منہ اٹھا کر واپس چل دیا (یعنی) دنیا و آخرت دونوں کو کھو بیٹھا)۔ اس آیت کی تفسیر میں جتنے اقوال ذکر کیئے گئے ہیں ان میں اگرچہ بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، لیکن مقصد اور مفہوم کے اعتبار سے سب ایک ہیں۔ تمام ہی مفسرین اس رائے پر متفق ہیں کہ صیب (بارش) کی تمثیل یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ظاہری ایمان کے لیے بیان کی ہے، اندھیرے سے ان کی حقیقی اور واقعی گمراہی کی طرف اشارہ ہے، اس کی بجلی کی چمک سے نور ایمان مراد ہے اور کڑک اور گرج سے ڈر کر جو وہ اپنی انگلیاں کانوں میں لیتے ہیں، وہ ان کے دل کی کمزوری، سرگردانی اور اللہ کے عذاب سے ڈر اور خوف ہے، پھر بجلی کی روشنی میں وہ تھوڑی دور چلتے ہیں یعنی نور ایمان پر انھیں تھوڑی دیر کے لیے استقامت حاصل ہوجاتی ہے، لیکن جوں ہی اندھیرا ہوا بس کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی بہر حال وہ اپنی گمراہی اور کفر میں حیران و سرگرداں ہیں۔ ہم نے ابنِ مسعود اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی جو متفقہ تفسیر اس آیت کی بیان کی ہے کہ منافقین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تو اپنے کانوں میں انگلی ٹھونسے رہتے تھے کہ مبادا کہیں حضور اکرم ﷺ ان کے متعلق کوئی آیت نہ سنادیں یا ان کی کسی منافقانہ سرگرمی کا ذکر ہوجائے اور وہ قتل کردیئے جائیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر یہی قول اس آیت کی تفسیر میں زیادہ مناسب ہے لیکن مجھے اس روایت میں شبہ ہے۔ بہرحال اگر اس قول کی ان حضرات کی طرف نسبت

کے سلسلے میں روایت صحیح نہ ہوتو پھر وہ تفسیر زیادہ بہتر ہے جو ہم نے کی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شروع سورت ہی سے منافقین کا ذکر چھیڑا ہے، اور بتایا ہے کہ وہ " اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ " کہکر اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ حقیقتاً وہ ان امور پر ایمان نہیں رکھتے، بلکہ ان کی طرف سے ان کے دلوں میں شک اور مرض ہے۔ قرآن مجید نے جس موقعہ پر بھی ان کے اوصاف بیان کیے ہیں تو ان کے اسی دو رخے پن کا ذکر کیا ہے، اور اس آیت میں بھی ان کے یہی اوصاف بیان کیے ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا، کانوں میں انگلی ٹھونس لینے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے خوف کی تمثیل اس لیے بیان کی ہے کہ وہ بھی اسی طرح ڈرے اور سہمے رہتے تھے جیسے بجلی کی گرج اور کڑک سننے والا شخص (جب کہ وہ گھر سے دور کہیں میدان میں ہو اور اندھیری رات ہو) ڈرا، سہما رہتا ہے اور ڈر کے مارے کانوں میں انگلی ٹھونسے رہتا ہے۔ اسی طرح " حذر الموت " (موت کے اندیشے سے) بھی ان کی خوف زدگی اور سراسیمگی کی مثال ہے کہ کہیں انھیں ان کے کرتوتوں کی ابھی سزا نہ مل جائے، اسی طرح گرج اور کڑک سننے والا بھی خوف کھا کھا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے " وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ " (حالانکہ اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ ان پر اللہ عذاب نازل کرے گا۔ مجاہد نے فرمایا، مطلب یہ ہے کہ اللہ انھیں جمع کرنے والا ہے (جہنم میں، قیامت کے دن) اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کے زبانی اقرار اور ان کے نفاق کی طرف دوبارہ اشارہ کیا ہے اور اس تمثیل کی تکمیل کی ہے جس کا بیان اس آیت میں ہو رہا ہے، ارشاد ہوا ہے یکاد البرق یخطف ابصارھم " (قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے جائے) یہاں بجلی سے مراد ان کا وہی زبانی اقرار ہے جو انھوں نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے اظہار کے موقعہ پر کیا تھا، بتایا گیا ہے کہ اس کی روشنی اتنی تیز ہے کہ اس سے ان کی بینائی ہی ختم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی " یکاد البرق یخطف ابصارھم " کی تفسیر یہی منقول ہے کہ (یخطف ابصارھم کا معنی ہے) یذھب بھم (یعنی ان کی بینائی اچک لے جائے)۔ " خطف " کے معنی سلب کے آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد میں ہے کہ آپ نے " خطفہ " سے منع کیا تھا، خطفہ کا بھی مفہوم " لوٹ اور اچک لے جانا " ہے۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (اللہ اگر چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کر لیتا) یہاں منافقین کے کان اور ان کی بینائی ہی کا خاص طور سے اس لیے ذکر ہوا کہ اس سے پہلے کی دو آیتوں میں ان کے یہی دونوں اعضاء خاص طور سے زیر بحث رہے ہیں، یعنی " کڑک کے سبب وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں "۔ اور دوسری آیت میں " قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے جائے "، چونکہ تمثیل کے طور پر ان کا ذکر پہلے ہی سے ہوتا آرہا تھا، اس لیے یہاں بھی وعید میں انھیں دونوں اعضاء کے سلب کر لینے کا ذکر کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چونکہ انھوں نے حق کو پہچان کر اسے چھوڑ دیا تھا اس لیے ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے کان اور بینائی سلب کر لے گا۔ ان اللّٰہ علیٰ کل شیٔ قدیر (بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے) یہاں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر اپنی قدرت وسطوت کا خاص طور سے اس لیے ذکر کیا کہ منافقین کی فریب دہی پر انھیں متنبہ کرنا تھا اور انھیں اپنی سطوت و شوکت سے ڈرانا تھا کہ وہ انھیں گھیرے ہوئے ہے اور ہر وقت ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کر لینے پر قادر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً

عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت۔

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا

اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردۂ عدم سے نکالا بذریعہ اُس پانی کے پھلوں کی غذا کو تم لوگوں کے واسطے اب تو مت ٹھہراؤ

لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اللہ کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو۔

خطاب عام

اس سے پہلے کی آیات میں مشرکین اور منافقین کو الگ الگ خطاب کیا گیا تھا اور ان کے اوصاف اور دین کے بارے میں ان کی روش بیان کی گئی تھی، اب یہاں سے دونوں طبقوں کو ایک ساتھ خطاب کیا جا رہا ہے کہ وہ ذات جس نے تمہیں، تمہارے آباء واجداد و تمام مخلوق کو پیدا کیا اور جس کے ہاتھ میں تمہارا نفع ونقصان ہے، وہی عبادت وطاعت کے لائق ہے، بُت اور تمہاری ہی طرح کی مخلوق عبادت کے لائق ہرگز نہیں۔ انھیں تمہیں نفع ونقصان پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اعبدوا ربکم" کا مطلب ہے "تنہا اپنے رب ہی کی عبادت کرو"۔ ہم اس سے پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ عبادت کے معنی اللہ کی طاعت میں خضوع وخشوع اور اس کے حضور میں خلوص اور خاکساری کے ساتھ جھکنے کے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو مفہوم اس کا بتایا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ طاعت وعبادت صرف اللہ کی کی جائے، کسی مخلوق کو اس میں شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے کہ "یا ایھا الناس اعبدوا ربکم" سے کفار ومنافقین دونوں کو خطاب ہے، یعنی صرف اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا۔ "لعلکم تتقون" یعنی شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ، اپنے پیدا کرنے والے رب کی عبادت وطاعت کر کے، جن امور کا اُس نے تمہیں حکم دیا ہے، اُنھیں بجا لا کر اور جن امور سے روکا ہے، انھیں ترک کر کے، اور اس طرح تم اس کی ناراضی اور غصہ سے اپنے کو بچا سکو اور ان پرہیزگاروں میں سے بن جاؤ جن سے اللہ راضی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے.... "لعلکم تتقون" کے متعلق فرمایا کہ مطلب ہے، شاید کہ تم اطاعت کرنے والے بن جاؤ۔ آیت میں "لعل" اپنے حقیقی معنی یعنی شک وشبہ ظاہر کرنے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے رب کی عبادت کرو، تاکہ اس کی اس طاعت وتوحید کے نتیجہ میں پرہیزگار بن جاؤ۔ "الذی جعل لکم الارض فراشا" یہ جملہ بھی اللہ رب العزت ہی کے اوصاف بیان کرنے کے لیے آیا ہی یعنی اپنے رب کی عبادت کرو، جو تمہارا پیدا کرنے والا ہے، تم سے پہلے والوں کو پیدا کرنے والا ہے، اور جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا ہے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے سلسلے میں روایت ہے کہ مفہوم یہ ہے، زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا، تم اس پر چلتے پھرتے ہو، یہ تمہارے لیے گہوارہ ہے، قرار وسکون کی جگہ ہے۔ "والسماء بناء" (اور آسمان کو ایک چھت بنایا) آسمان کو عربی میں "سماء" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ زمین کے اوپر ہے، ہر چیز جو کسی دوسری چیز کے اوپر ہو تو وہ اپنی نیچے والی چیز کی حیثیت سے "سماء" کہلائے گی، گھر کی چھت کو بھی اسی لیے اس گھر کا "سماء" کہتے ہیں۔ ابن مسعود، ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے کہ آسمان زمین کے اوپر قبہ کی طرح معلوم ہوتا ہے اور آسمان، زمین کے لیے چھت کے حکم میں ہے۔ اپنی نعمتوں کے ذیل میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے آسمان اور زمین کا اس لیے ذکر کیا کہ انسانوں کی روزی اور معیشت اور دنیا کے تمام امور کے لیے یہ دونوں چیزیں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "وانزل من السماء ماء الخ" یعنی تمہارے رب ہی نے آسمان سے پانی اتارا، اور پھر اس پانی سے وہ چیزیں نکالیں جو تم زمین سے اگاتے ہو، کھیتیاں، درخت اور ان کے پھل! یہ سب تمہاری غذا اور تمہاری روزی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور سلطانی کا ذکر کر کے تنبیہ کی ہے کہ اسی نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے، وہی تمہیں روزی دیتا ہے اور تمہاری کفالت کرتا ہے، وہ بت اور معبودانِ باطل نہیں، جنھیں تم اس کا شریک وسہیم ٹھہراتے ہو۔ پھر مزید تنبیہ کی کہ اس علم کے بعد کہ ان تمام چیزوں کا خالق صرف اللہ رب العزت ہے، اب تمہیں

اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرانا چاہیئے "فلا تجعلوا للہ انداداً"، انداد، "ند" کی جمع ہے۔ مثل اور برابر کے معنی ہیں، جو چیز کسی دوسری چیز کے مثل اور اس کے مشابہ ہو وہ اس کی "ند" کہلاتی ہے۔ "ند" کے یہی معنی قتادہ اور مجاہد رحمہا اللہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عباس رضؓ ابن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے روایت ہے کہ "فلا تجعلوا للہ انداداً"، یعنی انسانوں میں سے اللہ کے برابر کسی کو نہ ٹھہراؤ، کہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی بات مانو۔ یزید سے روایت ہے کہ آیت میں "انداد" سے مراد وہ معبود ہیں جنھیں وہ اللہ کے شریک کی حیثیت سے مانتے تھے اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو شرک سے اور طاعت و عبادت میں اپنا کسی کو برابر اور ساجھی ٹھہرانے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح تمہیں پیدا کرنے، تمہیں روزی دینے اور جتنے بھی میرے انعامات تم پر ہیں، ان میں میرا کوئی بھی شریک وسہیم نہیں، اسی طرح تمہیں بھی میری عبادت اخلاص کے ساتھ کرنی چاہیئے اور میرا، میری ہی مخلوق میں سے کسی کو شریک اور ساجھی نہ ٹھہرانا چاہیئے، کیونکہ اتنا تم بھی جانتے ہو کہ یہ ساری نعمتیں صرف میری ہی طرف سے ہیں، "وانتم تعلمون" (یعنی تم جانتے بھی ہو)، اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ اس جملے "وانتم تعلمون" کے مخاطب کون لوگ ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد مشرکین عرب اور اہل کتاب سب ہی ہیں۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ صرف اہل کتاب سے خطاب ہے۔ پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ آیت کفار و منافقین سب ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، وہ نہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، جبکہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی تمہیں روزی دینے والا نہیں اور یہ کہ اللہ کے رسول جس توحید کی تمہیں دعوت دیتے ہیں وہ حق ہے۔ دوسرا قول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یعنی تورات، انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں سے تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے اس خطاب میں جو اہل کتاب کی تخصیص کی ہے، غالباً اس کی وجہ اہل عرب کا شرک اور اللہ کے سوا سیکڑوں بتوں کی پرستش ہے، یعنی عرب نہیں جانتے تھے کہ صرف اللہ ہی اکیلا خالق و رازق ہے، ورنہ عبادت میں دوسروں کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے؟ لیکن قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے کئی مواقع پر فرمایا ہے کہ مشرکین عرب بھی خالق و رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے اور اس طرح اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے تھے، اگرچہ اس کی عبادت میں شرک سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ایک موقعہ پر ارشاد ہے "لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ" (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا، تو کہیں گے کہ اللہ نے)، ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے "قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ"، (کہیئے کہ کون تم کو رزق دیتا ہے آسمان اور زمین سے، اور کون مالک ہے تمہاری سماعت اور تمہاری بینائی کا، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور کون نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے، اور کون کرتا ہے تدبیر امور کی، یقیناً وہ اس کا جواب دیں گے کہ ان سب کو اللہ ہی انجام دیتا ہے، تو پھر آپ ان سے کہیئے کہ کیا اب بھی نہیں ڈرتے)۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کی طرح خود عربوں کو بھی اس کا علم تھا کہ اللہ ایک ہے، جس نے مخلوق کو پیدا کیا اور وہی سب کو روزی دیتا ہے۔ پس "وانتم تعلمون" میں خطاب عام ہے، تمام انسانوں سے، خود آیت کی ابتداء "یا ایھا الناس" (اے انسانو!) سے یہ بتاتی ہے کہ مخاطب ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ اس لئے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اس پوری آیت میں خطاب ہر اس شخص سے ہے جو وحدانیت کے اقرار اور شرک سے پرہیز کا مکلف ہے، عربی ہو یا عجمی، پڑھا لکھا ہو یا جاہل۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ

اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا

اور بلالو اپنے حمایتیوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں اگر تم سچے ہو پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے

وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ

اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں

أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

تیار ہوئی رکھی ہے کافروں کے واسطے

ایک دائمی چیلنج

اب تمام مشرکین عرب، منافقین اور اہل کتاب کو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ایک دائمی چیلنج دیا جارہا ہے۔ ان الذین کفروا سواء علیہم سے یہاں تک جن جن طبقوں کو خطاب کیا جاچکا ہے، ان سب سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مشرکین عرب، اے کفار اہل کتاب! اگر تم اس کتاب کے بارے میں شک میں ہو، جو ہم نے اپنے بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری ہے، اس نور، برہان اور واضح نشانیوں کے بارے میں تمہیں کوئی شبہ ہے اور اس لیے تم اس کی تصدیق نہیں کرتے، تو پھر تم کوئی ایسی دلیل لاؤ جو اُن کی دلیل کا توڑ بن سکے، تم خود جانتے ہو کہ ہر نبی اپنے دعوۂ نبوت کی سچائی کے لیے دلیل (معجزہ) پیش کرتا ہے اور وہ اپنی جگہ پر اتنا اٹل اور ناقابلِ تسخیر ہوتا ہے کہ تمام مخلوق مل کر بھی اس جیسی کوئی چیز لانی چاہے تو ممکن نہیں، پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور ان کی نبوت کی صداقت کے لیے دلیل اور معجزہ وہ قرآن ہے جو ان پر میری طرف سے نازل ہوا ہے، اب تم بھی کوشش کرکے دیکھو، جہاں سے تمہیں مدد مل سکتی ہو، حاصل کرلو اور قرآن جیسی ایک سورت پیش کرو، اگر تم اپنی تمام کوششوں کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ تمہیں عربی زبان و ادب میں پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمہارے یہاں بڑے بڑے فصیح و بلیغ موجود ہیں، اس جیسی کوئی ایک سورت بھی پیش نہیں کرسکتے تو تمہیں خود سمجھ لینا چاہیئے کہ دوسرا بھی کوئی اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکتا۔ ایسی صورت میں تمہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ کلام، خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام نہیں ہوسکتا، ورنہ تم اس کی نظیر اور مثال پیش کرنے سے عاجز نہ ہوتے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہیں، تمہاری طرح جسم رکھتے ہیں اور تمہارے ہی ماحول میں انھوں نے زبان...... سیکھی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک عام انسان کی حیثیت سے جو چیز وہ پیش کریں، اس کی نظیر و مثال پیش کرنے سے تمام مخلوق عاجز ہو۔ اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں کہ "فاتوا بسورة من مثله" (تو کوئی ایک سورت اس جیسی تم بھی بنا لاؤ) سے کیا مراد ہے؟۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد ہے، اس قرآن جیسی کوئی سورت، جس میں حق و صداقت کا مضمون ہو، جو باطل اور جھوٹ سے پاک ہو۔ مجاہد سے بھی یہی روایت ہے کہ مثلہ سے مراد مثل قرآن ہے۔ کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ انسانوں میں سے محمدؐ جیسا کوئی لاؤ، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمہاری ہی طرح انسان ہیں۔ لیکن صحیح تفسیر مجاہد اور قتادہ رحمہا اللہ ہی کی ہے۔ "وادعوا شهداءكم من دون الله ان كنتم صٰدقين" (اور اگر تم سچے ہو تو اللہ کے مقابلے میں اپنے حمایتیوں کو بھی بلالاؤ) کی تفسیر میں بھی کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مطلب ہے، اپنے مذہب و مسلک میں اپنے حمایتیوں اور مددگاروں کو بلاؤ، اگر تم سچے ہو۔ لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ ان لوگوں کو بلاؤ جو تمہارے حق میں گواہی دے سکیں۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تم قرآن کے مقابلے میں کوئی سورہ بنا کر لاؤ تو اپنے گواہوں کو بھی ساتھ لیتے آؤ، تاکہ وہ تمہاری بنائی ہوئی سورت پر گواہی دے سکیں۔ اصل میں یہ خطاب ان کفار سے ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور آپ پر نازل ہونے والی وحی کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا کرتے تھے، اور مطلب یہی ہے کہ اپنے حمایتیوں اور مددگاروں کو بلالاؤ، (دعوا، عربی محاورہ میں اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شہداء، شہید کی جمع ہے، جیسے شرکاء، شریک کی، خطباء، خطیب کی۔ شہید؛ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی دعوے پر، اسے پختہ اور ثابت کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص کے حق میں گواہی دے، کسی واقعہ کے پیش آنے کے وقت موجود رہنے والے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور اس لیے

(ادعوا اور شہید، دونوں کے مفہوم کا لحاظ رکھتے ہوئے) ہمارا خیال ہے کہ بہتر تفسیر وہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یعنی جب تم کوئی سورہ بنا کر لاؤ تو ساتھ ہی اپنے مددگاروں اور حمایتیوں کو بھی لیتے آنا، تاکہ اللہ اور رسول کو جھٹلانے میں وہ تمہاری مدد کر سکیں اور کفر و نفاق میں تمہارا ساتھ دے سکیں۔ جو تفسیر مجاہد اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے اس کی کوئی خاص وجہ نہیں سمجھ میں آتی۔

"فان لم تفعلوا ولن تفعلوا" یعنی اگر تم اس جیسی سورت نہ لا سکو، اور یقیناً تم کبھی اس جیسی سورت نہیں لا سکتے، "فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارۃ" یعنی دلیل اور معجزہ اور اس ثبوت کے بعد کہ واقعی یہ قرآن میرا کلام ہے اور میں نے اسے وحی کے ذریعہ نازل کیا ہے، اب تم اسے جھٹلاؤ مت، بلکہ جہنم سے ڈرو۔ اس کے بعد جہنم کے اوصاف بیان کئے ہیں کہ (خدا کی نافرمانی کرنے والے) لوگ اس کا ایندھن ہیں اور پتھر اس کا ایندھن ہیں یہاں پتھر سے مراد خاص گندھک کا پتھر ہے، جس کے متعلق سب جانتے ہیں کہ آگ لگ جانے پر اس کی گرمی کی شدت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مراد خاص گندھک کا پتھر ہے، جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی تخلیق کی تھی اسی دن اسے بھی پیدا کیا تھا اور یہ اللہ نے کافروں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ وہ گندھک کا سیاہ رنگ کا پتھر ہوگا جس سے جہنم والوں کو عذاب دیا جائے گا "اعدت للکفرین" یعنی یہ جہنم ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اس کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ ہی رب ہے، وہی تنہا آسمان و زمین کا خالق ہے، اسی نے زمین کو فرش بنایا ہے اور آسمان کو چھت! اور اسی نے آسمان سے پانی برسایا اور تمہارے لئے روزی اور پھل پیدا کیے ہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور خوشخبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کرتے رہے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہونگی ان کے نیچے سے نہریں

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ

جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا۔ اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ بہشتوں میں ہمیشہ کیلئے بسنے والے ہونگے

عظیم بشارت

بشر، یعنی خبر دے دیجئے، بتا دیجئے۔ بشارت کا اصل مفہوم ہے ایسی خبر دینا کہ جسے خبر دی جا رہی ہے وہ اسے سن کر خوش ہو جائے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کی مخلوق میں جو لوگ اس پر، اسکے رسول اور اس کے بھیجے ہوئے دین پر ایمان لائے ہیں اور عملاً بھی اپنے ایمان کی سچائی اور صداقت کا مظاہرہ کیا ہے، انھیں یہ پیغام پہنچا دیں کہ ان کے لیے (آخرت میں) ایسے باغات تیار کیے گئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغات میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی جنھوں نے آپ کو جھٹلایا، آپ کی لائی ہوئی ہدایت کا انکار کیا اور آپ سے دشمنی کی، اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی ان باغات میں کوئی جگہ نہیں ہوگی جنھوں نے اگرچہ زبانی ان سب چیزوں کا اقرار کیا، لیکن دل سے آپ کو وہ بھی جھوٹا سمجھتے رہے، بلاشبہ ان لوگوں کی جگہ جہنم ہے، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ جنّات جنّت کی جمع ہے یعنی باغ، جنت سے مراد یہاں وہ نعمتیں ہیں جو بہشت کے اندر ہونگی یعنی باغات، پھل اور پھول، اس کی زمین یا احاطہ مراد نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس کی صفت کے طور پر "تجری من تحتها الانھر" (اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں) کا ذکر کیا یعنی نہر کا پانی جو درختوں اور پھلوں کے سائے سے ہو کر گذرتا ہے، رواں دواں! سرحق

رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جنت میں کھجور کے درخت، جڑ سے شاخ تک تہ بتہ ہوں گے، اس کے پھل مٹکوں جیسے (بڑے بڑے) ہوں گے، جب بھی کوئی پھل توڑا جائے گا تو دوسرا پھل اس کی جگہ آجائے گا اور اس کا پانی سطح زمین پر جاری ہوگا۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدق دل سے ایمان اور عبادت کی ترغیب دلائی کہ جنتیوں کے لیے اس نے جنت میں نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، لیکن اس کے برخلاف جہنم میں جانے والے دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے "کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا قالوا هذا الذی رزقنا من قبل، یعنی جب انھیں، ان باغات کے درختوں میں سے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں، کوئی پھل کھانے کے لیے دیا جائیگا تو وہ بول اٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے مل چکا ہے۔ مفسرین کا "هذا الذی رزقنا من قبل" (یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے مل چکا ہے)، کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا، یعنی یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دنیا میں مل چکا ہے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جنت میں ان کے پاس پھل لایا جائے گا، جب جنتی اسے دیکھیں گے تو بول اٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں دنیا میں مل چکا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں گے، یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے جنت کے پھلوں میں سے مل چکا ہے۔ کیونکہ جنت کے مختلف قسم کے پھل رنگ اور ظاہر میں ایک دوسرے سے اتنے مشابہ ہوں گے کہ تمیز کرنا مشکل ہوگا۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی قول منقول ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ رنگ میں تو تمیز واقعی مشکل ہوگی، لیکن مزا سب کا الگ الگ ہوگا۔ یحییٰ بن ابی کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جنتی کے پاس پھل لایا جائے گا اور وہ اس میں سے کھائے گا، پھر دوبارہ لایا جائے گا تو وہ کہے گا کہ یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے ہمارے پاس لایا گیا تھا، لانے والا فرشتہ جواب دے گا کہ کھاؤ تو سہی، رنگ اگرچہ ایک ہے، لیکن مزا سب کا الگ الگ ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اور ترتیب سے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنتیوں کی مراد دنیا کے پھلوں سے ہوگی، کہ جو پھل انھوں نے دنیا میں کھائے تھے، یہ بھی وہی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ آیت میں ہے کہ "کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا الخ (یعنی جب بھی جنتیوں کو جنت میں وہاں کے پھل کھانے کے لیے دیئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں مل چکا ہے)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد کسی خاص موقعہ پر ہی وہ اس حیرت کا اظہار نہیں کریں گے، بلکہ جب بھی انھیں پھل کھانے کے لیے دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ دخول جنت کے بعد سب سے پہلی مرتبہ جب ان کے سامنے پھل لایا جائے گا اس وقت بھی وہ یہی کہیں گے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا اشارہ جنت کے پھلوں کی طرف نہیں، بلکہ دنیا کے پھلوں کی طرف ہی ہو سکتا ہے، یعنی یہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہم دنیا میں کھا چکے ہیں جیسے کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلاں شخص نے تمہارے لیے مرغ، بھنے ہوئے گوشت اور میٹھی چیزیں پکوائی ہیں، اور وہ اس کے جواب میں کہے کہ اپنے گھر بھی میں یہی کھاتا ہوں، تو مطلب یہ ہوگا کہ جن اقسام کے کھانوں کا تم نے ذکر کیا ہے، گھر پر بھی میں وہی کھانے کا عادی ہوں "واتوا به متشابها" میں "به" کی ضمیر رزق کی طرف لوٹتی ہے، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جو پھل انھیں کھانے کے لئے دیئے جائیں گے وہ واقعی ہوں گے بھی ملتے جلتے" متشابه (ملتے جلتے)، کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جنت کے پھل ملتے جلتے ہوں گے، کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے تمام پھل عمدہ اور لذیذ ہی ہوں گے، کوئی خراب یا بدمزہ نہ ہوگا۔ حضرت حسن، قتادہ اور ابن جریج رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ "رنگ میں ملتے جلتے ہوں گے، لیکن مزا سب کا مختلف ہوگا۔" ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ سے یہی روایت ہے۔ یہی مجاہد اور ربیع بن انس رحمہما اللہ کا بھی قول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ "رنگ اور مزے دونوں میں ملتے جلتے ہوں گے"، کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ "جنت کے پھل اور دنیا کے پھل رنگ میں ملتے جلتے ہوں گے لیکن دونوں کا مزہ مختلف ہوگا"۔ قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ سے بھی یہ روایت ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ جنت کی کوئی چیز دنیا جیسی نہیں ہوگی، البتہ صرف نام ان کے ملتے جلتے ہوں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ تفسیر بھی منقول ہے اور عبدالرحمٰن بن زید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ میرے نزدیک ان تمام اقوال میں ان حضرات کی تفسیر زیادہ بہتر ہے جنھوں نے کہا ہے کہ رنگ اور دیکھنے میں تو جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے

ہوں گے، لیکن مزے میں مختلف ہوں گے۔ ہم نے اس سے پہلے کی آیت "کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزقا" کے متعلق لکھا تھا کہ جنتیوں کو اشتباہ دنیا کے پھلوں سے ہوگا، یہ جملہ بھی اسی آیت کا ایک ٹکڑا ہے اور جنتیوں کے اس کہنے کی اس میں وجہ بیان کی گئی ہے کہ "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے"، اس لیے اس کا مفہوم بھی اسی کے مطابق ہوگا۔ اور یہ کہنا تو قطعاً کتاب اللہ کی صراحت کے خلاف ہے کہ دنیا کی کوئی چیز کسی حیثیت سے جنت کی کسی چیز کے مشابہ نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی جنت اور آخرت کی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان کیے ہیں، تو انھیں دنیا میں جانے پہچانے ناموں ہی سے پکارا ہے، اس لیے اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ نام کی حد تک ان میں اشتراک ضرور ہے، اب رہ جاتا ہے رنگ اور ظاہری صورت میں اشتراک کا مسئلہ تو نام کے اشتراک کے بعد یہی زیادہ فہم کے قریب ہے کہ ظاہر اور رنگ میں بھی اشتراک ہو، یہ الگ بات ہے کہ جنت کے رنگ بھی دنیا کے رنگوں کے مقابلے میں دیکھنے میں کہیں زیادہ بھلے معلوم ہوں گے، اور مزا تو مختلف ہوگا ہی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے دنیا میں بھیجا تو انھیں جنت کے پھل بھی دیئے تھے اور انھیں لگانے اور ان کی رکھوالی کا ڈھنگ بھی سکھایا تھا، تو تمہارے دنیا کے پھل، جنت ہی کے پھلوں سے نکلے ہیں، فرق اتنا ہے کہ دنیا کے پھل سڑ گل جاتے ہیں، لیکن جنت کے پھلوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی "ولہم فیہا ازواج مطہرۃ"، میں لہم کی ضمیر الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات (جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے) کی طرف لوٹتی ہے اور فیہا کی ضمیر جنات کی طرف لوٹتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے کہ ان کے لیے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ مطہرۃ (پاکیزہ) کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عورتوں کی جو گندگی یا برائی ہوتی ہے، مثلاً حیض ونفاس، پاخانہ، پیشاب، تھوک وغیرہ، جنت کی بیویاں ان تمام گندگیوں سے پاک ہوں گی، ابن عباس، ابنِ مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ "ازواج مطہرۃ"، سے مراد یہ ہے کہ ان بیویوں کو نہ حیض آئے گا، نہ پاخانہ، پیشاب اور نہ ناک وغیرہ کی کوئی گندگی ان میں ہوگی۔ اسی طرح کی روایت مجاہد، قتادہ، حسن اور ربیع بن انس رحمہم اللہ سے بھی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گناہ اور گندگی سے وہ پاک ہوں گی "وہم فیہا خالدون" یعنی ایمان لانے اور عملِ صالح کرنے والے ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ جو ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتیں اور روزی انھیں دیگا، اس سے وہ ہمیشہ نفع اندوز ہوتے رہیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر کی ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو سو جو لوگ ایمان لائے

آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا

ہوئے ہیں خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال تو بہت ہی موقع کی ہے انکے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں سو خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ یونہی کہتے رہینگے

ملہ اس موقعہ پر یہ ملحوظ رہے کہ عالم آخرت کے یہ انعامات عمومی انداز میں بیان کیے گئے ہیں، عام حالات میں لوگوں کو اسی طرح کی چیزیں مرغوب اور پسندیدہ ہوتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بس وہاں کی نعمتیں یہی ہیں یا اسی نوعیت کی ہیں۔ احادیث میں مختلف مواقع پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ جنت میں ہر شخص کو خوش رکھا جائے گا، اور اس لیے ہر وہ چیز اس کے سامنے پیش کی جاتی رہے گی جو اسے پسند ہوگی اور جس سے اسے خوشی اور مسرت حاصل ہوگی مثلاً اگر کسی کو بجائے سبزہ وگلزار کے، ریگستان و بیابان پسند ہیں، تو اس کے ذوقِ صحرا نوردی کی تسکین کے لیے جنت میں بیابان بھی اسے مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ (مترجم)

أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ

وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اسکی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے

بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ

اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنیوالوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے ہیں ان

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

تعلقات کو جن کو حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں بس یہ لوگ پورے خسارہ میں پڑنے والے ہیں

غیر معقول اعتراض

ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں یعنی آگ روشن کرنے والے اور آسمان سے گرنے والی بارش کی مثالیں بیان کیں (جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے) تو منافقین نے کہا کہ اللہ اس سے بلند و برتر ہے کہ اس طرح کی مثالیں بیان کرے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں "ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ" سے "اولئک ھم الخاسرون" تک نازل کیں۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مثال دنیا کی دی ہے کہ مچھر اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک وہ کچھ نہ کچھ بھوکا بھی رہے، لیکن جب اس پر چربی چڑھ جاتی ہے تو مرجاتا ہے، یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جن کی مثال اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ جب دنیا انھیں خوب اچھی طرح حاصل ہوجاتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ انھیں پکڑتا ہے۔ پھر آپ نے (مزید وضاحت کے لیے) اس آیت کی تلاوت کی "فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ" (جبکہ بھلا دیا انھوں نے اس چیز کو جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے کھول دیئے ان پر دروازے ہر چیز کے (یعنی خوب ڈھیل دی)۔ آیت کی تفسیر میں قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال بیان کرے مچھر کی یا اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز کی (یعنی اللہ تعالیٰ حق کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا، خواہ کم ہو یا زیادہ، بیان کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا تو گمراہ لوگوں نے اعتراض کیا کہ بھلا ان معمولی چیزوں کے ذکر سے اللہ کا کیا مقصد ہوسکتا ہے! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ہمارے نزدیک ان تمام اقوال میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول سب سے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ یہ آیت آئی بھی ہے انھیں دو مثالوں کے بعد جو منافقین کی بیان کی گئی ہیں، مطلب یہ ہے کہ حق کے لیے مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا، خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس سے ایک مقصد اپنے بندوں کو آزمانا بھی ہوتا ہے، تاکہ اہل ایمان و تصدیق اور اہل کفر و ضلالت میں تمیز ہوجائے۔ دوسری طرف اس سے گمراہوں کی گمراہی کو بڑھاتا ہے اور ہدایت پائے ہوئے لوگوں کو ہدایت پر مضبوطی اور رجحان عطا کرتا ہے۔ اسی طرح کا قول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔ بعض حضرات نے ان اللہ لا یستحی میں یستحی کا مفہوم یخشیٰ (ڈرتا ہے) بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یخشیٰ، یستحی کے معنی میں آتا ہے اور یستحی، یخشیٰ کے معنی میں۔ یضرب کا مفہوم ہے بیان کرتا ہے، وصف ذکر کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے نہیں ڈرتا کہ ایسی کسی چیز کی مثال بیان کرے جن میں کسی حیثیت سے مشارکت و مماثلت ہو۔ فما فوقھا، یعنی اس سے (مچھر سے) بڑھ کر۔ ہم نے قتادہ اور ابن جریج رحمہما اللہ کا قول بیان کیا ہے کہ مچھر (بعوضۃ) خداوند تعالیٰ کی کمزور ترین مخلوق ہے یعنی کمزوری اور ضعف میں سب سے آخری چیز کا ذکر ہوا، اس لیے فما فوقھا سے مراد اس سے بڑھکر ہی کوئی چیز ہونی چاہیئے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "فما فوقھا" سے مراد مچھر سے بھی کمزور اور کمتر چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کی برائی بیان کرے اور کہے کہ وہ تو نہایت سے

زیادہ بدتر شخص ہے۔ اس پر سننے والا کہے کہ نعم وفوق ذالک (ہاں اس سے بھی بڑھکر) تو یہاں فوق سے مراد برائی میں بڑھکر ہے (اسی طرح آیت میں کمزوری اور ناتوانی میں مجھ سے بڑھ کر مراد ہوگا) فاما الذین اٰمنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم یعنی جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جو مثال اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے وہ یقیناً حق ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ یقین کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے اور یہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً یعنی جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کر چکے ہیں اور پہچاننے اور سمجھنے کے بعد اسے چھپاتے ہیں، تو وہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ اللہ کا اس مثال سے مقصد کیا تھا؟ یہ اصلاً منافقین کی صفت ہے اور پھر گمراہی میں ان کے ساتھی، مشرکین اور اہل کتاب بھی اس میں آجاتے ہیں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مومنین تو اس پر ایمان لاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ انھیں ہدایت دیتا ہے لیکن فاسقین کو اس سے گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ فرمایا کہ مومن اسے سمجھتا ہے اور اس پر ایمان لاتا ہے لیکن منافق اسے سمجھ کر پھر اس کا کفر کرتا ہے یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً یعنی اللہ تعالیٰ اس مثال کو بیان کر کے بہت سے اہل نفاق وکفر کو گمراہ کرتا ہے (اور بہتوں کو اس سے راہ بھی دکھاتا ہے)۔

ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے کہ "بہتوں کو اس سے گمراہ کرتا ہے" سے اشارہ منافقین کی طرف ہے اور "بہتوں کو اس سے ہدایت دیتا ہے" سے اشارہ مومنین کی طرف ہے۔ یعنی ان منافقین کی گمراہی میں اور اضافہ کر دیتا ہے، گمراہ تو وہ پہلے ہی سے تھے اب انھوں نے اللہ کی ایک اور نشانی کی تکذیب کی۔ اس حق کو جھٹلانے سے ان کی گمراہی اور بڑھ گئی۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے انھیں گمراہ کرنے کا۔ لیکن بہت سے اہل ایمان وتصدیق کو اس سے ہدایت دیتا ہے اور ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے، اس لئے کہ پہلے ہی سے وہ اللہ کے دین کی تصدیق کرتے تھے اور اسے حق اور سچا جانتے تھے، اب انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی اس مثال کی بھی تصدیق کی اور اس پر بھی ایمان لائے۔ یہی مطلب اللہ تعالیٰ کا انھیں ہدایت کرنے سے ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وما یضل بہ الا الفاسقین (ہاں وہ گمراہ کسی کو اس سے نہیں کرتا بجز بے حکمی کرنے والوں کے) ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حکم عدولی کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی میں انھیں اور بڑھا دیا۔

کلام عرب میں "فسق" کسی چیز سے نکلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ اس وقت بولتے ہیں جب تازہ کھجور کو چھلکے سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ چوہے کو عربی میں فُوَیْسَقَۃٌ اس لئے کہتے ہیں کہ ہر وقت وہ اپنی بل سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ اسی طرح منافق اور کافر کو فاسق کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی اپنے رب کی طاعت وعبادت سے نکل گئے ہیں اور اس کا حکم ماننے سے انکار کیا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں ابلیس کے لئے فسق کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ اِلَّآ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ (لیکن ابلیس نے (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا) وہ جنوں میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا) یہاں فسق عن امر ربہ کا مطلب ہے کہ وہ اپنے رب کی طاعت اور اس کے حکم کو ماننے سے نکل گیا (یعنی عدول حکمی کی)۔

الذین ینقضون عھد اللہ بعد میثاقہ یہ بھی انھیں فاسقین کی ایک خصوصیت بیان کی ہے جن کے متعلق فرمایا تھا کہ منافقین کی مثال جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے اس سے صرف وہی گمراہ ہوتے ہیں، یعنی وہ فاسقین (حکم عدولی کرنے والے) جو اپنے عہد کو اس کے استحکام کے بعد توڑتے ہیں۔ اس عہد کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کو نصیحت، انھیں اپنی طاعت کا حکم اور معصیت ونافرمانی سے ممانعت ہے جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی کی ہے اور اس عہد کو توڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے ان احکامات پر عمل نہیں کیا۔ دوسرے مفسرین نے

یہ کہا ہے کہ ان آیتوں میں خطاب کفار اہل کتاب اور ان کے منافقین سے ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ پہلی آیتیں ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم الخ اور من الناس من یقول اٰمنا باللّٰہ وبالیوم الآخر میں انھیں کفار اہل کتاب اور انھیں کے منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے انھوں نے کہا کہ اللّٰہ کے عہد سے مراد، جسے انھوں نے اس کے استحکام کے بعد توڑا وہ عہد ہے جو اس نے اپنی کتاب توراۃ میں لیا تھا کہ اہل کتاب اس کے احکام پر عمل کریں گے، اور پھر جب محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو ان کی پیروی کریں گے لیکن انھوں نے اس عہد کو اس طرح توڑ دیا کہ حضور اکرم کا جان بوجھ کر انکار کیا اور دوسرے لوگوں سے آپ کی نبوت کی بشارتوں اور توراۃ میں مذکور آپ کی نشانیوں کو چھپایا، اس کے متعلق اللّٰہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ انھوں نے اللّٰہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے معاوضے میں معمولی اور حقیر رقم حاصل کی، بعض مفسرین نے فرمایا کہ مراد تمام اہل شرک و کفر ہیں خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں اور اللّٰہ کے عہد سے مراد توحید کے وہ دلائل اور نشانیاں ہیں جو اس کے رب ہونے کو بتاتی ہیں، اور شریعت کے حق اور اللّٰہ کی طرف سے ہونے کے ثبوت میں انبیاء کے معجزات ہیں جن پر کوئی انسان قدرت نہیں رکھتا اور اس لیے وہ اس کا کھلا ثبوت ہیں کہ انبیاء اپنے دعوی میں سچے ہیں اور اس عہد کو توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام دلائل اور نشانیوں کی موجودگی میں انھوں نے توحید اور انبیاء کا انکار کیا۔

میرے نزدیک ان تمام اقوال میں سب سے بہتر اور مناسب قول یہ ہے کہ یہ آیتیں ان یہودی علماء کے متعلق نازل ہوئیں جو نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مدینہ میں موجود تھے، اور اسی طرح ان منافقین کے متعلق بھی جو انکار و کفر میں ان کے ساتھی تھے، اور جن کے واقعات ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ" اور "من الناس من یقول اٰمنا باللّٰہ وبالیوم الآخر" انھیں اہل کتاب اور منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کی تھی کہ اگرچہ نازل ہوتے وقت خاص مخاطب کفار کا یہی طبقہ تھا، لیکن اپنے مفہوم و مقصد میں یہ آیتیں عام ہیں اور ہر اس شخص سے اپیل کرتی ہیں جو اپنی زندگی ان کفار و منافقین کے سانچے میں ڈھال لے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر اس انداز میں خطاب جہاں بھی ہوا، تو مراد اہل کتاب ہی رہے ہیں۔ اسی سورۃ میں ایک موقعہ پر ہے "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ" (اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا، اور میرا عہد پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں)

گویا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللّٰہ تعالیٰ نہیں گمراہ کرتا، لیکن ان لوگوں کو جو اللّٰہ کے اس عہد کو چھوڑ دیتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہونے والی کتابوں اور اپنے انبیاء کی زبانی انھوں نے کیا تھا کہ ہم محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ان کی اتباع کریں گے، لیکن پھر انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا، یعنی اللّٰہ کے حکم کی مخالفت کی، یہی مضمون ایک دوسری آیت میں، انھیں اہل کتاب کے متعلق آیا ہے کہ "پھر ان کے بعد ان کے جانشین ہوئے (ایسے نالائق لوگ) کہ کتاب کو تو ان سے حاصل کیا لیکن، اس دنیا کا مال لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تو ضرور مغفرت ہو جائے گی، اور اگر ان کے پاس ویسا ہی مال پھر آجائے تو اسے (بھی) لے لیں، کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللّٰہ پر کوئی بات نہ گھڑیں اور صرف حق کہیں"۔

"من بعد میثاقہ" کا مطلب یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے اس عہد کا ان سے پوری طرح اقرار کروا لیے جانے کے بعد (پھر انھوں نے اسے توڑا)۔ ویقطعون ما امر اللّٰہ بہ ان یوصل (اور جس چیز کے جوڑنے کا اللّٰہ نے حکم دیا تھا اسے کاٹتے ہیں) میں اللّٰہ نے جس کے جوڑنے کی ترغیب اور کاٹنے کی مذمت کی ہے اس سے مراد وہ خونی رشتہ ہے جو ماں کے وجود سے تعلق رکھتا ہے۔ اس رشتہ کو کاٹنے سے مراد ہے ظلم اور اس سے متعلق جو حقوق اللّٰہ تعالیٰ نے واجب کئے ہیں ان کی عدم ادائیگی، چنانچہ قتادہ رحمۃ اللّٰہ علیہ نے فرمایا کہ مراد اللّٰہ کا وہ حکم ہے جو اس نے رحم کے تعلق کو جوڑنے سے متعلق دیا ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر غیر مناسب نہیں کہی جا سکتی، لیکن میرا خیال ہے کہ آیت تمام حقوق و فرائض کو شامل ہے یعنی یہاں اللّٰہ تعالیٰ نے مذمت ہر اس شخص کی کی ہے جو اللّٰہ کے حکم کو کاٹتا ہے، خواہ وہ حکم صلۂ رحمی سے متعلق ہو، یا کسی اور چیز سے "ویفسدون فی الارض" (اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں) "زمین میں فساد

پھیلانے" سے مراد کی ہم نے پہلے بھی وضاحت کر دی تھی یعنی اپنے رب کی معصیت و کفر کرتے ہیں اور اس کے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔
"اولٰٓئک ھم الخٰسرون"۔ خاسرون، خاسر کی جمع ہے یعنی جس طرح ایک شخص تجارت میں غلط روش اختیار کر کے خود نقصان میں رہتا ہے، اسی طرح انھوں نے اللہ کی نافرمانی کر کے اس کی رحمت سے ملنے والے اپنے حصے کو کم کر لیا ہے۔ بعض مفسرین نے اسکے معنی یہ بھی بتائے ہیں کہ "یہی لوگ ہیں ہلاک و برباد ہونے والے"۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ خاسر (نقصان میں رہنے والا) جیسے لفظ اگر اللہ تعالیٰ غیر مسلموں کے متعلق بیان کرے تو مراد کفر ہوتا ہے، لیکن اگر مسلمانوں کی طرف اس کی نسبت ہو تو مراد گناہ ہو گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ

بھلا کیونکر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تھے تم محض بے جان (نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا۔ پھر تم کو موت دینگے پھر زندہ کرینگے (یعنی قیامت

تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى

کے دن) پھر انھیں کے پاس لے جائے جاؤ گے۔ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کیلئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف

السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ۳ ع ۳

(یعنی اس کی تکمیل تخلیق کی طرف) سو درست کر کے بنا دیئے اُن کو سات آسمان۔ اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

حیرت ہے

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم، ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون ۝ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے آیت کا یہ مطلب منقول ہے کہ تم لوگ کس طرح اللہ کا کفر کرتے ہو، حالانکہ تم کچھ نہیں تھے، پھر اللہ نے تمھیں پیدا کیا، پھر وہی تمھیں موت دے گا، اور قیامت کے دن پھر وہی تمھیں دوبارہ زندہ کریگا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ (ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا) اور سورہ بقرہ کی اس آیت یعنی "کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم" کا مفہوم ایک ہے "امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین" کی تفسیر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ ہم کچھ نہیں تھے اور اللہ نے ہمیں زندگی دی، پھر ہمیں موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔

مجاہد اور ابوالعالیہ رحمہما اللہ سے بھی آیت کی یہی تفسیر منقول ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں تمھیں زندہ کرے گا اور پھر موت دے گا، یہ قول ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "تم اپنے آباؤ اجداد کی صلب میں مردہ تھے، پھر تمھیں اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی، یعنی پیدا کیا۔ پھر تم پر حقیقی اور واقعی موت طاری کرے گا اور پھر قیامت کے دن تمھیں زندہ کرے گا۔" ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تمام انسانوں کو عہد و میثاق لینے کے لئے، آدم علیہ السلام کی پشت سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تھا، پھر ان سے عہد لیا اور ان پر موت طاری کر دی پھر انھیں (فرداً فرداً) ماں کے رحم سے پیدا کیا۔ پھر موت دی (دنیا میں)، اور پھر قیامت کے دن انھیں زندہ کرے گا۔ ان تمام اقوال میں سب سے بہتر قول ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے کہ "کنتم امواتا" سے یہ مراد لیا جائے کہ تم کچھ نہیں تھے، یعنی اپنے آباؤ اجداد کی صلب میں تھے اور تمھارا ذکر کوئی نہیں کرتا تھا، پھر تمھیں اللہ نے پیدا کیا تو تمھارا ذکر ہونے لگا اور تم جانے پہچانے گئے، پھر تمھاری روح قبض کر کے تم پر موت طاری کرے گا، اور پھر قیامت کے دن تمھیں زندہ کرے گا۔

عربی محاورہ میں ایسی چیز کے لئے جو قطعاً بھلادی گئی ہو جس کا کوئی ذکر نہ ہوتا ہو، بولتے ہیں "هٰذَا شَيْءٌ مَيِّتٌ" یعنی اب اس کا کوئی ذکر نہیں، اس کے مقابلہ میں چالو چیز کے لئے بولتے ہیں "هٰذَا اَمْرٌ حَيٌّ"۔

یہ آیت بھی انھیں منافقین اور احبار یہود کی توبیخ کے لئے نازل ہوئی ہے جن کا ذکر پہلے سے چلا آرہا ہے۔ هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام چیزیں انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں، یعنی زمین اور اس میں موجود تمام چیزیں انسان ہی کے منافع کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان کی دینی منفعت یہ ہے کہ زمین اور اس کا ایک ایک ذرہ اللہ کی وحدانیت پر دلیل ہے اور دنیاوی منفعت یہ ہے کہ ان سے ہماری معاش پوری ہوتی ہے جس کے بعد ہم اللہ کے فرائض و واجبات کی ادائیگی کرسکتے ہیں۔ خلق کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کچھ نہیں تھے پھر اس نے پیدا کیا، آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کا کفر کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم اپنے آباء و اجداد کی صلب میں نطفہ تھے، اللہ نے تمھیں زندگی بخشی، اور انسانی شکل و صورت دی، پھر وہی تمھیں موت دے گا اور پھر وہی تمھیں جلائے گا اور وہی تمھارا حقیقی منعم و محسن ہے کہ اس نے تمھاری معاش اور تمھارے رب کی وحدانیت کو سمجھنے کے لئے زمین اور اس کی تمام چیزیں پیدا کیں۔ آیت میں کَیْفَ حیرت و تعجب اور توبیخ کے لئے ہے، اصل میں یہ لفظ سوال و استفہام کے لئے آتا ہے، لیکن یہاں یہ معنی مراد نہیں ہیں، گویا اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے، "افسوس تم کس طرح اللہ کا کفر کرتے ہو" ثم استوی الی السماء فسوٰھن سبع سموات" میں استوی الی السماء کی تفسیر کئی طرح کی گئی ہے۔ بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ "پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی" استوی عربی محاوروں میں بھی اس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے، بعض مفسرین نے استواد کو فعل دکرنے، کے معنی میں لیا ہے (یعنی زمین پیدا کرنے کے بعد آسمان کی تخلیق کی) بعض حضرات نے کہا ہے کہ استوی الی السماء کا مفہوم ہے "بہ استوت" (یعنی اللہ ہی کے حکم سے آسمان برابر ہوئے) بعض حضرات نے قصد و ارادہ ترجمہ کیا ہے، بعض مفسرین نے کہا کہ اس کا مفہوم ہے "علو" یعنی اوپر کی طرف جانا، یہ تفسیر ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے، جنھوں نے استوی کا مطلب عُلُوّ اور اوپر کی طرف جانا لیا ہے ان میں سے بعض حضرات کی رائے ہے کہ اوپر جانے والا اس کا خالق اور اس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اوپر جانے والا وہ دھواں تھا جسے اللہ تعالیٰ نے زمین کے لئے آسمان بنایا تھا، استوار کا استعمال کلام عرب میں متعدد اور مختلف مواقع پر ہوتا ہے۔ اچھی جوانی کیلئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، کسی کے معاملات سدھر جائیں تو اس موقع پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، عملاً توجہ کے لئے، کسی معاملہ پہ قابو پانے کے لئے، اور علو و ارتفاع کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، اور آیت میں سب سے بہتر اس کی تفسیر علو و ارتفاع ہی ہے، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیت میں جس استوی الی السماء (آسمان کی طرف جانے) کا ذکر ہے وہ آسمان کی تخلیق کے بعد صورت پذیر ہوا تھا یا پہلے ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ استوار آسمان کی تخلیق کے بعد، لیکن انھیں سات آسمانوں میں ترتیب دینے سے پہلے ہوا تھا، ایک موقع پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا" (پھر اللہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دھواں تھا، پس کہا آسمان اور زمین سے کہ آؤ تم خواہ خوشی سے یا جبر و قہر سے)۔ یعنی یہ فعل استوار، آسمانوں کو دھویں کی شکل میں پیدا کرنے کے بعد اور سات آسمانوں میں ان کی ترتیب دینے سے پہلے تھا، لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان کی تخلیق سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ فوراً ہی ذکر ہے کہ "فسوّٰھن سبع سموات" (پھر انھیں سات آسمان درست کرکے بنادیئے) یعنی ان کی تخلیق و تدبیر کی اور انھیں ٹھیک طریقہ پر بنایا، تسویہ کلام عرب میں تقویم و اصلاح کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نور اور تاریکی پیدا کی۔ پھر ان دونوں کو اس طرح جدا کیا کہ تاریکی کو اندھیری رات بنایا جس میں کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی۔ اور نور کو اُجالا۔ دن بنایا کہ جس میں سب کچھ

صاف دکھائی دیتا ہے، پھر اوپر بلندی پر سات آسمان دھویں سے بنائے۔

کہا جاتا ہے، اور صحیح علم اللہ ہی کو ہے، کہ پانی کے دھویں (بھاپ) سے آسمانوں کو پیدا کیا اور انھیں پائدار اور مضبوط بنایا، اور آسمانِ دنیا سے رات اور دن کا تعلق قائم کیا، اس وقت تک نہ سورج تھا، نہ چاند، اور نہ ستارے، پھر زمین کو ہموار کیا، ان پر کیلوں کی طرح پہاڑ لگائے۔ روئے زمین پر روزی مقرر کی، اور اپنی مخلوقات کو اس پر پھیلا دیا، اللہ تعالیٰ زمین اور اس کی روزی کی پیدائش سے چار دن کے اندر فارغ ہوا۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا، اس وقت آسمان دھواں تھا، اسے ترتیب دی، پھر آسمان دنیا پر چاند سورج اور ستارے پیدا کیئے، ہر آسمان پر اس سے متعلق امور واحکام نازل کیئے، ان کی پیدائش دو دن میں تکمیل کو پہنچی، اس طرح آسمان و زمین کی پیدائش اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں مکمل کی، پھر ساتویں آسمانوں کے اوپر متوجہ ہوا، اس کے بعد آسمانوں اور زمین سے کہا کہ " آؤ تم، خواہ خوشی سے یا جبر سے، تو انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آئے۔ آسمان و زمین کی تخلیق سے متعلق اس تفصیلی روایت سے آیت " پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ کی اور انھیں سات آسمان درست کر کے بنائے "، کی تفسیر سمجھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح کی روایت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی منقول ہے، آپ حضرات نے آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ تخلیق عالم سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا، پانی سے پہلے جو چیزیں پیدا کی گئی تھیں ان کے سوا ابھی اور کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جب مخلوق کی تخلیق کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے پانی سے دھواں (بھاپ) نکالا، دھواں اوپر اٹھا اور پانی کے اوپر معلق ہو گیا، اس لیئے اس کا نام " سماء " (آسمان) رکھا۔ پھر پانی کو خشک کر کے ایک زمین بنائی اور بعد میں اس میں سے سات زمینیں نکالیں، یہ کام دو دن، اتوار اور پیر میں مکمل ہوا۔ زمین کو مچھلی کے اوپر پیدا کیا تھا، یہ مچھلی وہی " نون " ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی آیت " ن، والقلم "، میں آیا ہے۔ یہ مچھلی پانی میں ہے، پانی چکنے پتھر پر ہے اور یہ پتھر فرشتہ کے اوپر ہے، فرشتہ چٹان پر ہے اور چٹان ہوا میں معلق ہے۔ یہی وہ چٹان ہے جس کے متعلق لقمان علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ نہ آسمان پر ہے اور نہ زمین پر! ۔ پھر مچھلی نے حرکت کی، جس سے اضطراب پیدا ہوا اور زمین میں زلزلہ آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد زمین پر پہاڑ گاڑ دیئے تو زمین میں سکون پیدا ہوا۔ اسی کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہوا ہے " وَجعل لہا رواسی ان تمیدبکم "، اور اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر پہاڑ رکھ دیئے ہیں، تاکہ وہ تم کو لے کر ڈگمگانے نہ لگے۔ اہل زمین کی روزی اور درخت وغیرہ دو دن، یعنی منگل اور بدھ میں پیدا کیئے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ " تم اس (خدا کی توحید) کے منکر ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کر دیا اور تم شریک ایسے کے ٹھہرا رہے ہو، وہی تو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور اسی نے زمین کے اوپر پہاڑ بنا دیئے اور اس (زمین) میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں "، یعنی چار دن میں زمین پر درخت اگائے اور اہل زمین کی روزی کے سامان پیدا کیئے " سَوَاءً للسائلین "، یعنی جو لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، انھیں بتا دیجئے کہ ہاں یوں ہی ہوا۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دھواں تھا۔ یہ دھواں پانی کی بھاپ کا تھا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک آسمان بنایا، پھر اس آسمان کو پھاڑ کر اس میں سے سات آسمان بنائے، یہ سب کچھ دو دن یعنی جمعرات اور جمعہ میں مکمل کیا، جمعہ کا نام " جمعہ "، اس لیئے پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی دن آسمان و زمین کی پیدائش کو جمع کیا تھا اور ہر آسمان پر اس سے متعلق احکام کی وحی نازل کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس نے ہر آسمان پر وہاں کی مخلوق پیدا کی، یعنی فرشتے اور وہ تمام مخلوق جو ان آسمانوں میں موجود ہے، جیسے دریا، برف کے پہاڑ اور بہت سی وہ چیزیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا، یہ ستارے زینت بھی ہیں اور ان کے ذریعہ شیاطین سے حفاظت بھی رہتی ہے۔ اپنے ارادہ اور منشاء کے مطابق مخلوقات کو پیدا کرنے کے بعد وہ عرش کی طرف متوجہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ " اس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا "، یہی مطلب ہے۔ اس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا "، (آسمان اور زمین بند تھے، پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا) مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے " ھو الذی، خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی اِلَی السَّمَاءِ "، کی تفسیر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا، زمین کی پیدائش جب ہو چکی تو اس سے ایک دھواں اٹھا، اسی کے متعلق ارشاد ہے کہ " پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ دھواں تھا "، پھر انھیں سات آسمان درست کر کے بنائے،

فرمایا کہ بعض آسمان بعض دوسرے کے اوپر ہیں، اسی طرح زمین بھی تہ بتہ ہے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش اتوار کے دن سے شروع کی تھی، چنانچہ زمین اس نے اتوار اور پیر کے دن پیدا کی، روزی اور پہاڑ منگل کے دن پیدا کیے، اور آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کے دن پیدا کیا، جمعہ کے دن کی آخری گھڑیوں میں ان کی تخلیق سے فارغ ہوا، پھر جمعہ ہی کے دن آخری وقت میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اور اسی وقت (جمعہ کے دن کی آخری ساعت) قیامت برپا[۱] ہوگی۔ "وھو بکل شئ علیم" ھو کی ضمیر سے مراد یہاں اللہ جل شانہٗ نے خود اپنی ذات لی ہے۔ یعنی اے منافقو اور اہل کتاب کے ملحدو، جس خدا نے تمہیں پیدا کیا، تمہارے لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں اور سات آسمانوں کو درست کر کے بنایا، اس سے تمہاری کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، خواہ اسے ظاہر کرو یا چھپائے رکھو، جو تم میں منافق ہیں، اگر وہ زبان سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دل کی بات جانتا ہے اور تم یہودیوں میں خاص طور سے جو اہل علم ہیں اور رسول اللہ صلعم کی نبوت و رسالت کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں انھیں بھی وہ جانتا ہے، بلکہ میں تمہارے ان معاملات کے علاوہ تمہارے دوسرے معاملات اور تمہارے علاوہ دوسروں کے تمام معاملات کی بھی خبر رکھتا ہوں، بلاشبہ میں ہر چیز کا جاننے والا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی جملہ کی تفسیر میں روایت ہے کہ "اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس کا علم کامل ہے۔"

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کہ آپ پیدا کریں گے

فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ

زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے ہیں بحمد اللہ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں آپ

لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

کی حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جسکو تم نہیں جانتے

اسرار

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ" میں "ملائکۃ" ملک کی جمع ہے (بمعنی فرشتہ)، ملائکہ کا واحد "مألک" بھی بعض لوگوں نے بتایا ہے۔ اس صورت میں اس کی جمع "مآلک" کے وزن پر آنی چاہئے تھی لیکن اس وزن پر کوئی جمع کلام عرب میں مجھے معلوم نہیں ہے، البتہ ملائک اور ملائکہ کے وزن پر اس کی جمع آتی ہے، جیسے اشعث کی جمع اشاعث اور اشاعثہ، مسمع کی جمع مسامع اور مسامعۃ آتی ہے۔ ملک، اصل میں پیام رساں کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی دوسری لغت مألک بھی

[۱] ظاہر ہے کہ یہ تمام تفصیلات اسرائیلی روایات سے تعلق رکھتی ہیں، ہمارے پاس ان امور کے علم کے دو مستند ذریعے ہیں، قرآن اور احادیث، ان دونوں میں تخلیق عالم سے متعلق اتنی تفصیلات نہیں ہیں جو آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہیں۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی طرف جو اقوال اس سلسلے میں منقول ہیں وہ بھی انتہائی ضعیف روایات سے ثابت ہیں، لیکن اگر انھیں روایتاً صحیح مان بھی لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہوں گے۔ بہر حال ان تفصیلات پر دین و ایمان کا کوئی مدار نہیں، ان کے متعلق تو ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ اگر قرآن و حدیث کے مطابق ہوں تو انھیں تسلیم کیا جائے، اگر خلاف ہوں تو انھیں رد کر دیا جائے۔ اور اگر خلاف بھی نہ ہوں تو ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے۔ (مترجم)

ہے۔ جن لوگوں نے اسے "ملأك" پڑھا ہے (جو ہمزہ کے حذف کے بعد ملک رہ گیا)، ان کے نزدیک یہ لأك اليه، يلئك، ملأكة سے مفعل کے وزن پر ہے بمعنی پیام رسانی کرنا لیکن جو لوگ اسے مألك کہتے ہیں، ان کے نزدیک الك اليه الكة ومالكة والوكا سے مفعل کے وزن پر ہے، اس کے معنی بھی پیام رسانی ہی ہے۔ ملائکہ کو ملائکہ کہتے بھی اسی پیام رسانی کے مفہوم کی وجہ سے ہیں کیونکہ یہ اللہ اور اس کے انبیاء کے درمیان پیام رسانی کا ذریعہ ہیں "انی جاعل فی الارض"، کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ حسن وقتادہ رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ "انی جاعل"، کا مطلب ہے "انی فاعل" (میں کرنا چاہتا ہوں)۔ لیکن بعض دوسرے مفسرین نے "جاعل" کا مطلب "خالق"، بیان کیا ہے (میں پیدا کرنا چاہتا ہوں)............ ابوروق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی "جعل"، استعمال ہوا ہے، خلق کے معنی میں ہوا ہے (پیدا کرنے کے)۔ میرا خیال یہ ہے کہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ"، کا مطلب یہ ہے کہ "میں زمین پر اپنا ایک نائب بنانا چاہتا ہوں"، میری یہ تفسیر حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما کی تفسیر سے زیادہ قریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس زمین کا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے وہ ارض مکہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا، تمام روئے زمین مکہ سے پھیلائی گئی۔ پہلے ملائکہ، بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے، بیت اللہ کا سب سے پہلے طواف کرنے والے یہی ملائکہ ہیں، اور یہی وہ زمین ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "میں زمین پر اپنا ایک نائب بنانا چاہتا ہوں"، اور جب کسی نبی کی قوم ہلاک ہو جاتی تو نبی قوم کے ان صالح افراد کے ساتھ جو عذاب سے محفوظ رہتے، مکہ میں آجاتے اور باقی ماندہ زندگی یہیں اللہ کی عبادت میں گذار دیتے۔ حضرت نوح اور ہود، صالح اور شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبریں زمزم اور مقام ابراہیم کے درمیان ہیں[1] "خلیفۃ"، فعیلۃ کے وزن پر ہے، اور "خلف فلان فلانا فی ھذا الامر"، سے ماخوذ ہے اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی دوسرے کا کسی معاملہ میں قائم مقام ہو جائے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، (پھر بنایا ہم نے تم کو خلیفہ زمین میں، ان کے بعد، تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو) اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہیں زمین میں ان کے بعد پیدا کیا اور تمہیں ان کا قائم مقام بنایا۔ ابن اسحاق سے "انی جاعل فی الارض خلیفۃ"، کی تفسیر میں (خلیفہ کا مفہوم) یہ منقول ہے کہ زمین میں ٹھہرنے والا اور اسے آباد کرنے والا لیکن یہ مفہوم خلیفہ کا نہیں ہے، اگرچہ ملائکہ کو اس اطلاع کا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں، لازمی مفہوم یہی نکلتا ہے کہ ہونے والا نائب زمین میں قیام کرے گا۔ پھر بھی آیت کا مفہوم وہی ہے جو میں نے بیان کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم سے پہلے زمین پر کون مخلوق آباد تھی جس کا بنی آدم کو خلیفہ بنایا گیا؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پہلے زمین میں جن رہتے تھے، لیکن انھوں نے فساد شروع کر دیا اور آپس میں قتل وخوں ریزی کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی سرکردگی میں ملائکہ کا ایک لشکر ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس لشکر نے جنوں کو قتل کیا اور جو باقی بچ گئے انھیں سمندروں کے جزیروں اور پہاڑوں کے اطراف میں چھوڑ آئے۔ پھر آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور زمین میں انھیں ٹھہرایا اسی لیے یہ ارشاد ہے کہ "میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں"، اس تفسیر کی بنیاد پر مطلب یہ ہوگا کہ بنی آدم جنوں کے خلیفہ (نائب) ہیں۔ اور ان کے بدلے میں اس زمین میں ٹھہرے ہیں اور اسے آباد کیا ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن پیدا کیا، جنوں کو جمعرات کے دن اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن پیدا کیا۔ پھر جنوں کی ایک جماعت نے کفر شروع کر دیا اس لیے ملائکہ اترتے اور جنوں سے جنگ کرتے (جنھوں نے کفر کیا تھا) چنانچہ زمین میں فساد وخونریزی کی گرم بازاری ہو گئی۔ دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ"، کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہوں جن میں بعض، بعض دوسروں کے نائب ہوں گے، اشارہ اولاد آدم کی طرف ہے جو اپنے والد آدم علیہ السلام کے نائب تھے، اور اس کے بعد ہر صدی کے لوگ اپنے سے پہلی

[1] یہ روایت موضوع ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے (مترجم)

صدی کے لوگوں کے نائب ہوئے۔ یہ قول حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ ابن سابط اور ابن زید رحمہا اللہ کے اقوال سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔ ایک روایت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ملائکہ کو کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانا چاہتا ہوں تو ملائکہ نے عرض کی، ہمارے رب! یہ خلیفہ کیسا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی نسل ہوگی جو زمین میں فساد کرے گی، آپس میں حسد کرے گی اور باہم ایک دوسرے کو قتل کرے گی۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی اس روایت کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ایسا نائب زمین پر بنانا چاہتا ہوں جو میری مخلوق کے درمیان فیصلہ میں میری نیابت کرے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے نائب آدم علیہ السلام تھے اور ان کے بعد تمام وہ بنی آدم نائب ہیں جو اللہ کی طاعت اور مخلوق کے درمیان عدل و انصاف کے سلسلے میں ان کی قائم مقامی کریں۔ جہاں تک فساد پھیلانے اور بغیر حق کے خون ریزی کا تعلق ہے تو یہ ان لوگوں کا کام ہوگا جو اللہ کی طاعت و عبادت میں آدم علیہ السلام کے قائم مقام نہیں ہوں گے۔ ایسا نہ آدم علیہ السلام نے کیا اور نہ آپ کی اولاد میں وہ طبقہ کرے گا جو آپ کا واقعی جانشین ہوگا۔ یہ تفسیر ایک حیثیت سے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق بھی ہے، کیونکہ دونوں تفاسیر یہ بتاتی ہیں کہ زمین میں فساد پھیلانے والا طبقہ آدم علیہ السلام کا جانشین اور خلیفہ نہیں ہوگا۔ خود اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین میں فساد پھیلانے اور خونریزی کرنے کے عمل سے پاک اور بری بنایا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف آپ کی ناخلف اولاد ہے جو فساد پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی۔

فرشتوں کا اعتراض بنی آدم پر

"قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء" (ملائکہ بولے کہ کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور آپ کی ذریت کی پیدائش سے پہلے ملائکہ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی یہ صفات ہوں گی؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ ابلیس کا تعلق ملائکہ کی ایک ایسی جماعت سے تھا جو جھلس دینے والی آگ سے پیدا کی گئی تھی، ابلیس کا نام حرث تھا اور جنت کے جو بہت سے داروغے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا، بیان کیا کہ اس جماعت کے سوا باقی تمام ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے تھے اور وہ جن، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے آگ کی لپٹ سے پیدا کیے گئے تھے، لیکن انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔ سب سے پہلے زمین پر جنوں نے سکونت اختیار کی۔ لیکن انھوں نے فساد برپا کیا اور آپس میں خونریزی کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی سرکردگی میں ملائکہ کی ایک جماعت بھیجی (جس کی تخلیق جھلس دینے والی آگ سے ہوئی تھی)، یہ وہی جماعت ہے جسے جن بھی کہا جاتا ہے (فرشتوں میں سے)۔ ابلیس نے جنوں کو قتل کیا اور جو باقی بچے انھیں جزیروں اور پہاڑی علاقوں میں دھکیل دیا۔ اس کارنامہ کی انجام دہی کے بعد ابلیس کو بہت غرور ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں نے ایسا کام کر دکھایا ہے جو اب تک کوئی نہیں کرسکا تھا۔ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ تو اس کے اس غرور سے واقف ہوگیا، لیکن ملائکہ کی جو جماعت اس کے ساتھ تھی وہ واقف نہ ہوسکی، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ملائکہ سے جو اس کے ساتھ گئے تھے فرمایا کہ میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں، اس پر ملائکہ نے عرض کی، کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، جیسا کہ اس سے پہلے جن ایسا کر چکے ہیں اور ہمیں اسی وجہ سے ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"، یعنی ابلیس کے دل میں جو کبر و غرور چھپا ہوا ہے میں اس سے پوری طرح واقف ہوں، لیکن تمہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ بیان کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی مٹی لانے کا حکم دیا اور وہ مٹی لائی گئی۔ پھر اللہ نے آدم علیہ السلام کو چکنی اور کھنکھناتی ہوئی مٹی سے خود اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام کا جسم یوں ہی چالیس دن تک پڑا رہا، اس عرصہ میں ابلیس ان کے جسم کے پاس آتا اور اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر مارتا، جب ٹھوکر لگتی تو اس سے کھنکھناہٹ کی آواز نکلتی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "آدم علیہ السلام کو اس نے مثل ٹھیکرے کے کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔" بیان کیا کہ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس جسم میں سر کی طرف سے روح پھونکی تو روح جس حصہ سے بھی

گذرتی وہاں گوشت اور خون پیدا ہو جاتا۔ جب روح گھٹنے تک پہنچی تو آدم نے اپنے جسم کو دیکھا۔ انھیں اس کی ساخت بہت پسند آئی اور فوراً اٹھنے لگے، لیکن اٹھ نہ سکے۔ اسی کی طرف اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ "انسان بہت جلد باز پیدا کیا گیا ہے"، یہ ارشاد تنبیہ کے طور پر ہے کہ نہ اسے فراخی کے حالات میں صبر ہے اور نہ تنگی میں۔

بیان کیا کہ جب روح سارے جسم میں سرایت کر گئی تو آدم علیہ السلام کو چھینک آئی اور کہا "الحمد للہ رب العٰلمین" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ان کے دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کی اس حمد کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یرحمک اللہ یا آدم" (اے آدم! تجھ پر اللہ رحم کرے)۔ بیان کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے خاص ان ملائکہ سے جو ابلیس کے ساتھ جنوں کی سرکوبی کے لیے گئے تھے، فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ یہ حکم ملائکہ کی دوسری جماعتوں کو نہیں ہوا تھا۔ اس پر ملائکہ کی اس جماعت کے ہر ہر فرد نے انھیں سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے اپنے اس کبر و غرور کی وجہ سے جو اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا سجدے سے انکار کیا اور کہا کہ میں اسے سجدہ نہیں کروں گا، میں اس سے افضل ہوں، عمر میں بھی بڑا ہوں اور تخلیق کے اعتبار سے بھی بڑھ کر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔ اور آگ کا مرتبہ مٹی سے بڑھا ہوا ہے۔ بیان کیا کہ جب ابلیس نے اللہ کے حکم سے انکار کیا تو اللہ نے بھی سزا کے طور پر اسے بھلائی اور خیر سے محروم کر دیا اور اسے راندۂ درگاہ شیطان بنا دیا۔ پھر "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کل کے کل نام سکھائے"، یعنی انھیں چیزوں کے نام جو انسانوں میں آج جانی پہچانی ہیں، جیسے انسان، جانور، زمین، میدان، دریا، پہاڑ، گدھا وغیرہ دوسری مخلوقات۔ پھر "ان ناموں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا"، یعنی فرشتوں کی اس جماعت کے سامنے جس سے ابلیس تعلق رکھتا تھا اور جن کی پیدائش جھلس دینے والی آگ سے ہوئی تھی۔ اور ان سے کہا کہ "بتاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو"۔ بیان کیا کہ جب ملائکہ کو اس کا احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں تنبیہ کی ہے، کیوں کہ انھوں نے ایسے معاملات پر گفتگو کی تھی جن کا خدا کے سوا کسی کو علم نہیں اور ان فرشتوں کو بھی علم نہیں، تو انھوں نے عرض کی "پاک ہے تیری ذات"، اس جملہ میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی کہ واقعی تیرے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔ "ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دے دیا"، اس جملہ میں فرشتوں نے اپنی برارت ظاہر کی کہ وہ علم غیب کا دعویٰ نہیں کرتے، ہاں جو تو نے ہمیں علم دے دیا وہ اس سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ تو نے آدم علیہ السلام کو ناموں کا علم دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے آدم بتا دو انھیں ان کے نام، پھر جب انھوں نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیے تو فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا"، یہاں بھی فرشتوں کی اسی خاص جماعت سے خطاب ہے "کہ میں آسمان اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں"، اس جملہ میں اشارہ اس کبر و غرور کی طرف ہے جو ابلیس نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ "میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں" میں خطاب فرشتوں کی ایک خاص جماعت سے تھا، تمام فرشتوں سے نہیں تھا، اور یہ کہ فرشتوں کی اس خاص جماعت سے ابلیس کا تعلق تھا اور اسی جماعت نے، آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے، زمین پر اتر کر جنوں سے جنگ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خاص اسی جماعت کو آدم علیہ السلام کے سلسلے میں ان کی آزمائش کے لیے خطاب کیا تھا، تاکہ اپنے علم کی کمی کا انھیں پوری طرح احساس ہو جائے اور یہ کہ بہت سی ایسی مخلوقات جو تخلیق اور پیدائش کی حیثیت سے ان سے کمزور ہیں، ان سے افضل اور بہتر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی کرامت اور فضیلت کا انحصار جسمانی طاقت و قوت پر نہیں ہے، جیسا کہ دشمن خدا ابلیس نے سمجھ رکھا تھا۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا یہ دعویٰ کہ "کیا تو زمین پر انھیں خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد برپا کریں گے اور خونریزی کریں گے"، یوں ہی بلا کسی خاص علم و تحقیق کے تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں مطلع کیا کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ناپسندیدہ ہے، چنانچہ فرشتوں نے توبہ کی، اللہ کی پاکی بیان کی اور اس سے برارت ظاہر کی کہ اللہ کے سوا بھی کوئی علم غیب جان سکتا ہے! لیکن ابلیس نے اس کبر و غرور کا مظاہرہ کیا جو اس کے دل میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف بھی ہے، یہ روایت ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی نقل ہے کہ جب اپنی مرضی کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو پیدا کر چکا تو

عرش کی طرف متوجہ ہوا، اور ابلیس کو آسمانِ دنیا پر مامور کیا۔ ابلیس کا تعلق فرشتوں کی ایک خاص جماعت سے تھا جنھیں جن کہتے تھے۔ ان کا نام "جن" اس لیے پڑا تھا کہ یہ "جنت" کے نگراں تھے۔ ابلیس آسمانِ دنیا کے اُمور کی نگرانی کے علاوہ جنت کا بھی نگراں تھا۔ اس لیئے اب وہ سوچنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سب کچھ اس لیئے عطا کیا ہے کہ میرے اندر خود ذاتی کمالات موجود ہیں۔ جب وہ اس طرح کی باتیں سوچنے لگا تو قدرتی طور پر اللہ تعالیٰ کو اس کے ان خیالات کا علم ہوا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر ایک نائب بنانا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کی، ہمارے رب! وہ نائب کیسا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے ایک نسل چلے گی جن میں ایسے افراد بھی پیدا ہوں گے جو زمین پر فساد برپا کریں گے، آپس میں حسد کریں گے اور خوں ریزی کریں گے۔ اس پر فرشتوں نے عرض کی، ہمارے رب! کیا آپ اس میں ایسے کو بنائیں گے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم آپ کی حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور آپ کی پاکی پکارتے رہتے ہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اشارہ ابلیس کے حالات اور اس کی دلی کیفیات کی طرف تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو زمین پر مٹی لانے کے لیئے بھیجا۔ جب آپ زمین پر پہنچے تو زمین بولی، میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر آپ مجھ میں سے کچھ کم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ مٹی لیئے بغیر واپس آگئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ زمین نے آپ کی پناہ مانگی، اس لیئے میں نے اسے پناہ دے دی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میکائیل علیہ السلام کو بھیجا، زمین نے ان سے بھی پناہ مانگی اور وہ بھی مٹی لیئے بغیر واپس آگئے اور اللہ کے حضور میں جبرئیل علیہ السلام نے زمین کی جو بات کہی تھی انھوں نے بھی وہی کہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ملک الموت علیہ السلام کو بھیجا، زمین نے ان سے بھی پناہ مانگی تو انھوں نے کہا لیکن میں بھی اس سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ اس کے حکم کی تعمیل کے بغیر واپس چلا جاؤں! چنانچہ انھوں نے زمین سے مٹی لی اور سب کو ملا دیا، آپ نے ایک جگہ سے مٹی نہیں لی تھی، بلکہ سرخ، سفید اور سیاہ ہر طرح کی مٹی مختلف مقامات سے لی۔ یہی وجہ ہے کہ بنی آدم صورت و رنگ کے اعتبار سے مختلف پیدا ہوئے ہیں[له]۔ آخر ملک الموت لے کر آسمان کی طرف گئے اور بعد میں اس نے چکنی مٹی کی جب شکل اختیار کرلی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان کو پیدا کرنا چاہتا ہوں، جب میں اسے برابر کردوں اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونک دوں تو تم اسے سجدہ کرنا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، تاکہ ابلیس ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھے اور تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے کہہ سکے کہ تو ایسی مخلوق کے مقابلے میں تکبر کرتا ہے جسے میں نے خود اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انسان کی صورت میں پیدا کیا۔ مٹی سے بنا ہوا ان کا یہ جسم چالیس سال تک اسی حالت میں رہا، یہ چالیس سال جمعہ کے دن کے برابر تھا (غالباً تخلیق مخلوقات کے سلسلہ کے آخری دن جمعہ کی طرف اشارہ ہے)۔ فرشتے ادھر سے گذرے تو جسم کو دیکھ کر ڈر گئے تمام ملائکہ میں سب سے زیادہ خوف زدہ ابلیس تھا، اس لئے جب وہ ادھر سے گذرتا تو اس پر لات مارتا، جس سے ٹھیکرے کی طرح اس سے آواز نکلتی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ (آدم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے) مثل ٹھیکرے کے کھنکھناتی ہوئی

له دنیا میں پائی جانے والی چیز کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، جس طرح کسی چیز کے ظاہری اسباب ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے باطنی اسباب بھی ہو سکتے ہیں، ظاہری اسباب و علل کی تلاش و تحقیق ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن باطنی اسباب کا تعلق تکوینیات سے ہے اور انکا صحیح علم صرف اللہ تعالےٰ کو ہے، اسکے باوجود اس نے بعض اسباب و علل بتا دیئے ہیں، اور ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ جس حد تک اور جن جن چیزوں کے اسباب باطنی ہمیں بتائے گئے ہیں اور صحیح روایتوں سے ہم تک پہنچے ہیں ہم ان پر ایمان لائیں کیونکہ انکا تعین اور تحقیق علم ہماری حدود سے باہر ہے اور اس سلسلہ میں جن امور کی نشاندہی شریعت نے کی ہے ان سے آگے نہ بڑھیں اور نہ ان پر دوسرے امور کو قیاس کریں کیونکہ ایک چیز کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں اور اسمیں کوئی اشکال اور تعارض نہیں ہے مثلاً یہی انسان کا رنگ و صورت کے اعتبار سے اختلاف، طبعیاتی علوم اسکی وجہ دوسری بتاتے ہیں، لیکن اس روایت میں اسکی جو وجہ بیان کی گئی ہے اسکا تعلق اسباب باطنی سے ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں، شریعت میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور مختلف مقامات پر چیزوں کے تکوینیاتی اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (مترجم)

مٹی سے (پیدا کیا)۔ ابلیس کہتا کہ آخر کس ضرورت کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ اس جسم کے منہ کی طرف سے داخل ہوتا اور پیچھے سے نکل جاتا۔ اس نے فرشتوں سے یہ بھی کہا کہ تم لوگ اس سے خوف مت کھایا کرو تمہارا رب بے نیاز ہے اور تمام ضرورتیں اس سے پوری کی جاتی ہیں، اور یہ تو کھوکھلا ہے۔ میں اگر اس پر قابو پا گیا تو اسے تباہ کر دونگا۔ جب وہ وقت آیا جسے اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کے جسم میں روح ڈالنے کے لئے متعین کیا تھا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں روح پھونک دوں تو تم لوگ اسے سجدہ کرنا۔ جب اللہ تعالےٰ نے اسمیں روح پھونکی اور روح سر کی طرف سے داخل ہوئی تو آدم چھینکے ملائکہ نے ان سے کہا کہ "الحمد اللہ" کہئے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہارے رب نے تم پر رحم کیا۔ پھر جب روح آنکھوں میں پہنچی تو انھوں نے جنت کے پھل دیکھے اور جب پیٹ تک پہنچی تو کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس پر آدم علیہ السلام پاؤں تک روح پہنچنے سے پہلے ہی اٹھنے لگے، جنت کے پھلوں کو جلدی سے حاصل کر لینے کے لئے!۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے کہ "انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے"۔ اس کے بعد تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا اور کبر و غرور کا مظاہرہ کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ نے اس سے پوچھا، جب میں نے تمہیں حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو، پھر سجدہ کرنے سے تمہیں کیا چیز مانع ہوئی، میں نے تو خود اسے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا؟ ابلیس نے جواب دیا کہ میں اس سے افضل اور بہتر ہوں، ایک ایسی مخلوق کو میں کیوں سجدہ کرنے لگا جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے اسے حکم دیا کہ تو یہاں سے نکل جا، یہاں تکبر کرنا تجھے زیب نہیں دیتا، نکل جا، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بیان کیا" اور اللہ نے آدم علیہ السلام کو کل کے کل نام سکھا دیئے۔ پھر مخلوق کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا بتلاؤ تو ان کے نام اگر تم سچے ہو، یعنی اپنے اس دعوے میں کہ (تمام) بنی آدم زمین پر فساد برپا کریں گے اور خون بہائینگے فرشتوں نے کہا" پاک ہے تیری ذات، ہمیں کوئی علم نہیں، سوا اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا، بلا شبہ تو ہی بڑا علم والا حکمت والا ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے آدم بتلا دو انھیں ان کے نام۔ پھر جب انھوں نے ان کے نام بتا دیئے تو فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو کہ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، وہ سب جانتا ہوں۔ بیان کیا کہ فرشتوں کا یہ دعویٰ کہ "کیا تو زمین میں ایسے کو بنائے گا جو اسمیں فساد برپا کرے گا" یہی وہ چیز تھی جسے فرشتوں نے ظاہر کیا، اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا کہ میں وہ بھی جانتا ہوں جسے تم چھپاتے ہو، یعنی وہ کبر و غرور جو ابلیس نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ اس روایت کا ابتدائی حصہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پہلی روایت سے مختلف ہے، لیکن آخری حصہ دونوں روایتوں کا ایک ہے۔ کیونکہ اس روایت کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ وہ نائب کیسا ہوگا۔ اور اللہ تعالےٰ نے جواب دیا تھا کہ اسکی نسل چلے گی جن میں زمین پر فساد برپا کرنے والے جسد کرنے والے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے والے بھی پیدا ہونگے اسی وجہ سے فرشتوں نے کہا تھا کہ کیا تو زمین پر ایسے کو بنائے گا جو اسمیں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے اس دعویٰ کی بنیاد نسل آدم سے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع پر تھی۔ لیکن "أَنْۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ" (بتلاؤ ان کے نام اگر تم سچے ہو) یعنی اس دعویٰ میں سچے ہو کہ بنی آدم زمین پر فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے، اس کے بعد آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ منقول ہے وہ دونوں روایتوں میں یکساں ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس روایت کے ابتدائی اور آخری حصوں میں کوئی جوڑ نظر نہیں آئے گا کیونکہ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ نسل آدم میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے۔ اب اگر اس اطلاع کی بنیاد پر ملائکہ نے ان کے متعلق کہا کہ "کیا تو ایسے کو بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا" تو اس میں زجر و توبیخ کی کیا بات تھی؟ کیونکہ ملائکہ نے

جو کچھ کہا وہ اس بنیاد پر کہا جو اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دی تھی اپنی طرف سے تو انھوں نے کوئی بات نہیں کہی تھی! اس لئے میرا خیال ہے کہ اس روایت کے بعض راویوں سے صحابہ سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ البتہ بجائے اس کے اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ" (بتلاؤ ان کے نام اگر تم سچے ہو) کی تفسیر یہ ہونی چاہیے کہ میری اطلاع کی بنیاد پر جو تم نے یہ خیال کرلیا کہ تمام بنی آدم زمین پر فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ اور زجر و توبیخ اس پر ہو کہ میری ایک اطلاع پر تم نے عام اور کلی حکم لگانے کی جرأت کیسے کی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ انھیں بتایا تھا کہ ہونے والے نائب کی نسل میں سے فساد برپا کرنے والے اور خونریزی کرنے والے بھی ہوں گے، لیکن پوری نسل آدم کے متعلق یہ اطلاع نہیں تھی، بلکہ نسل آدم میں سے ایک طبقہ کے متعلق ورنہ ایک طبقہ ایسا بھی ہوگا جو اللہ کی زمین پر طاعت و عبادت کرے گا، اصلاح کی کوشش کرے گا، خون کی حفاظت اور اس کی قدر و منزلت لوگوں کے دلوں میں بٹھائے گا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صراحت نہیں کی تھی اس لئے ملائکہ نے کہا کہ کیا تو ایسے کو بنائے گا جو زمین پر فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ ہم نے فرشتوں کے اس دعوے کے متعلق کہ کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا" جو یہ کہا کہ انکی مراد تمام نسل آدم سے تھی، اس کی تائید عبدالرحمٰن بن سابط رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس آیت کی تفسیر میں ان سے منقول ہے، انھوں نے فرمایا کہ فرشتوں نے یہ جملہ تمام انسانوں کے متعلق کہا تھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان آیتوں کی تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر نائب بنانا چاہتا ہوں اور فرشتوں سے بھی آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں پوچھا تو انھوں نے کہا، کیا تو اسمیں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ فرشتوں کو اللہ کی طرف سے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ خون بہانے اور زمین پر فساد برپا کرنے سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں اور کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں (فرشتوں نے کہا) حالانکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں (اللہ نے فرمایا، یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ تو تھا ہی کہ اس نائب کی نسل میں انبیاء، رسول، صلحاء افراد اور جنت کے مستحق بھی پیدا ہوں گے۔ بیان کیا کہ ہمیں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی بتایا کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے والا تھا اس زمانہ میں فرشتوں نے یہ کہا کہ اللہ کوئی ایسی مخلوق نہیں پیدا کرے گا جو ہم سے افضل یا ہم سے زیادہ علم رکھنے والی ہو اس لئے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلے میں انھیں آزمایا گیا۔ اور ہر مخلوق آزمائش میں ڈالی گئی، آسمان و زمین کو بھی اطاعت کے سلسلہ میں آزمایا گیا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسے فرمایا کہ "آجاؤ تم دونوں، خواہ اپنی مرضی سے یا خلاف مرضی انھوں نے کہا کہ ہم اپنی مرضی سے حاضر ہوئے"۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ملائکہ کا یہ قول کہ "کیا تو بنائے گا زمین میں اسکو جو اسمیں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا" کسی پہلے سے خاص علم و یقین کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ یہ صرف انکی اپنی رائے اور اپنا گمان تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کی کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی یہ کہ اس نائب کی نسل سے انبیاء اور اللہ کی اطاعت و عبادت کرنے والے پیدا ہوں گے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس سلسلہ میں اور بھی منقول ہے اس روایت کے مطابق آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا تھا کہ زمین میں ایک مخلوق تھی جس نے فساد برپا کیا تھا اور خونریزی کی تھی، اسی لئے فرشتوں نے بھی تخلیق آدم کے موقع پر عرض کیا کہ آپ ایسے کو بنائیں گے جو فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا"۔ آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بصری اور ربیع بن انس رحمہما اللہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جہنم پیدا کی تو فرشتے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے اور عرض کی اے اللہ! یہ آگ آپ نے کیوں پیدا کی ہے اور کس کے لئے پیدا کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کے لئے ہے جو میری مخلوق میں سے میری نافرمانی کریں گے بیان کیا کہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سوا اور کوئی (جاندار) مخلوق پیدا نہیں کی تھی، اس وقت زمین پر کوئی مخلوق موجود نہیں تھی، آدم علیہ السلام اس واقعہ کے بعد پیدا کیے گئے ہیں، پھر دلیل کے

طور پر) آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا "هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا" (انسان پر ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا) عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! کاش وہی وقت ہوتا (اور ہم وجود میں نہ آئے ہوتے) ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ اس پر فرشتوں نے کہا، اے ہمارے رب! کیا کوئی ایسا بھی وقت آسکتا ہے کہ ہم تیری نافرمانی کرنے لگیں۔ یہ انھوں نے اس لئے کہا تھا کہ اپنے سوا اور کسی زندہ مخلوق کا انھیں علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس سوال پر فرمایا کہ ایسا تو نہیں ہوگا (کہ تم میری نافرمانی کرو) لیکن میں زمین میں ایک مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اسمیں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں (انمیں بہت سے ایسے بھی ہونگے) جو خون بہائیں گے اور زمین میں فساد برپا کرینگے اللہ تعالیٰ کی اس اطلاع پر فرشتوں نے عرض کی، کیا آپ ایسے کو بنائیں گے جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔ آپ اسکے بجائے ہمیں زمین میں بھیج دیجئے، ہم وہاں آپ کی حمد کی تسبیح پڑھیں گے، آپ کی پاکی بیان کریں گے اور آپ کی طاعت و فرمانبرداری کریں گے۔ فرشتوں نے اسے بہت اہمیت دی کہ اللہ تعالیٰ زمین میں ایسے کو بنانا چاہتا ہے جو خود اس کی نافرمانی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب انھیں دیا کہ بلاشبہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" ابن اسحاق اور ابن جریج رحمہما اللہ سے بھی آیت کی تفسیر اسی طرح منقول ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ فرشتوں نے "کیا آپ زمین میں اس کو بنائیں گے جو وہاں فساد کرے گا اور خون بہائے گا" اس لئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے سلسلہ میں خود فرشتوں کو سوال کرنے کی اجازت دی تھی، اور پہلے ہی سے انھیں بتا دیا تھا کہ بنی آدم میں ایک طبقہ واقعی ایسا کرے گا۔ فرشتوں نے یہ سوال حیرت اور تعجب کے طور پر کیا تھا کہ اے رب! وہ تو تیری ہی مخلوق ہوگی، تو اس کا خالق ہوگا، پھر وہ تیری نافرمانی کس طرح کر سکیں گے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ دیا کہ "بلاشبہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"، یعنی وہ ایسا کریں گے، اگرچہ تم اسے ابھی نہیں سمجھو گے۔ عربی زبان و محاورات پر عبور رکھنے والے بعض علما کا خیال ہے کہ فرشتوں کا یہ کہنا انکار کے طور پر نہیں تھا، بلکہ نئی مخلوق کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک سوال کی حیثیت سے تھا، دوسری طرف انھوں نے اپنے متعلق جو اسکا اظہار کیا "کہ ہم تیری حمد کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں پاکی بیان کرتے رہتے ہیں" یہ انھوں نے اس لئے کہا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے، انھیں ایک سابقہ تجربہ بھی اس کا تھا کہ جنوں نے اللہ کی نافرمانی کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ سب سے مناسب اور بہتر تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ وہ ایک نائب پیدا کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے انکار کے طور پر یہ جملہ کہا تھا کہ کیا آپ زمین میں ایسے کو بنائیں گے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا اگرچہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں اطلاع دیدی گئی تھی تو انھیں یقین تھا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا ہوگی جو اللہ کی نافرمانی بھی کرے گی۔ جن مفسرین کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سوال کی اجازت پہلے دیدی تھی، اس کی کوئی دلیل شریعت میں موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پہلے سے بتا دیا ہو کہ میں ایک نائب بنانے والا ہوں جس کی نسل میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے اس لئے فرشتوں نے کہا کہ کیا آپ ایسے کو زمین میں بنائیں گے جیسا کہ ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے

خلافت کے مستحق کیوں

"وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" نحن نسبح بحمدک، یعنی ہم تیری حمد و شکر کیساتھ عظمت بیان کرتے ہیں جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ونسبح بحمدک" یا جیسا کہ فرمایا "وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ" (اور فرشتے اپنے رب کی حمد کی تسبیح بیان کرتے ہیں) عربی میں ہر اس ذکر کو جو اللہ کے لئے ہو "تسبیح و صلوٰۃ" کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "تسبیح" فرشتوں کی نماز کو کہتے ہیں۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے (کوئی فرض نماز تھی)، وہیں ایک منافق بھی تھا اور نماز میں شریک نہیں تھا، ایک مسلمان صحابی ادھر سے گذرے تو اس سے کہا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نماز

نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور تم یوں ہی بیٹھے ہوئے ہو! اس پر منافق بولا، جاؤ اپنا کام کرو۔ صحابی نے فرمایا، میرا خیال ہے کہ ابھی تمہارے پاس تم پر رونے والے آئیں گے (یعنی تمہاری موت کا وقت قریب آگیا ہے) تھوڑی دیر بعد عمر رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گذر ہوا۔ آپ نے بھی یہی فرمایا کہ اے فلاں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہیں، اور تو یوں ہی بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے انھیں بھی یہی جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر کام تو یہ ہے۔ اور اسے مارنے لگے۔ پھر آگے بڑھ گئے اور مسجد میں جاکر حضور اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس پہنچے اور عرض کی، یا رسول اللہ! ابھی جب آپ نماز پڑھ رہے تھے تو میں فلاں شخص کے پاس سے گذرا اور اس سے کہا کہ آنحضورؐ نماز پڑھ رہے ہیں اور تم بیٹھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا جاؤ، اپنا کام کرو۔ اس پر آنحضورؐ نے فرمایا تم نے اس کی گردن نہ ماردی! عمر رضی اللہ عنہ بڑی تیزی کے ساتھ اٹھ کر جانے لگے۔ لیکن حضور اکرم نے فرمایا، عمر! واپس آجاؤ تمہارا غصہ غلبہ اور عزت ہے اور تمہاری خوشنودی حلم ہے، اللہ تعالےٰ کو اس شخص کی نماز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے ساتوں آسمان میں فرشتے نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! انکی نماز کیسی ہوتی ہے؟ آنحضورؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام آئے اور کہا اے اللہ کے نبی! کیا آپ سے عمر نے آسمان والوں کی نماز کے متعلق سوال کیا ہے؟ آنحضور نے فرمایا کہ ہاں۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا، تو عمر کو سلام کہدیجئے اور بتادیجئے کہ آسمان والوں کی نماز یہ ہے کہ قیامت تک کے لئے وہ سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور کہتے رہتے ہیں سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ (پاک ہے ذات اس کی جو مالک ہے ملک کا اور ملکوت کا) دوسرے آسمان والے قیامت تک کے لئے رکوع میں پڑے ہوئے ہیں اور کہتے رہتے ہیں سُبْحَانَ رَبِّ الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ (پاک ہے وہ ذات جو عزت والی ہے اور جبروت والی ہے) اور تیسرے آسمان والے قیامت تک کے لئے کھڑے ہیں اور کہتے رہتے ہیں سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (پاک ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والی ذات جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی) ایک روایت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم آپ کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور آپ بھی آنحضور کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے (کسی موقعہ پر جب آنحضور بیمار پڑے ہونگے) ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ میرے باپ آپ پر قربان ہوں، اللہ تعالےٰ کو کونسا کلام سب سے زیادہ پسند ہے؟ آنحضرت نے فرمایا وہ جو اس نے اپنے فرشتوں کے لئے منتخب کیا ہے سُبْحَانَ رَبِّیْ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ رَبِّیْ وَبِحَمْدِہٖ (پاک ہے ذات میرے رب کی اور اسی کے لئے ہے حمد، پاک ہے ذات میرے رب کی اور اسی کے لئے ہے حمد) (ان دونوں روایتوں میں "سبحان" کا ذکر ملائکہ کی عبادت کے سلسلہ میں کیا گیا ہے جو تسبیح سے مشتق ہے) اہل عرب کے نزدیک "تسبیح" کا اصل مفہوم اللہ کی صفات میں ان چیزوں کے اضافہ سے اس کی پاکی بیان کرنا ہے جو واقعی اس کی صفات نہیں ہیں اس طرح اس آیت میں "نسبح بحمدک ونقدس لک" کے مفہوم کے سلسلہ میں بھی مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ یہاں "نسبح ونقدس" کا معنے "نماز پڑھنا" ہے، یعنی ہم تیری نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ تسبیح کا جو عام اور مشہور مفہوم ہے وہی یہاں بھی مراد ہے۔ "ونقدس لک" تقدیس (جس سے نقدس نکلا ہے) کے معنی پاکی اور عظمت بیان کرنے کے ہیں "سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ" بھی اسی سے نکلا ہے سبوح میں اللہ کی پاکی کا مفہوم ہے اور قدوس میں اسکی طہارت وتعظیم کا اظہار ہے "ارض مقدسۃ" (پاک زمین) بھی اسی سے مشتق ہے۔ اس لئے اب فرشتوں کی اس عرض کا کہ "ونحن نسبح بحمدک" مفہوم یہ ہوگا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری برات کرتے ہیں ان چیزوں سے جو اہل شرک تیری طرف منسوب کرتے ہیں، بلکہ ہم تیری نماز پڑھتے رہتے ہیں، تیری پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور تیری واقعی صفات بیان کرتے رہتے ہیں کہ تو تمام برائیوں سے پاک ہے، اور ان تمام صفات سے بھی جو اہل کفر تیری طرف منسوب کرتے ہیں "تقدیس" کے معنی نماز کے بھی لئے گئے ہیں، چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "نقدس لک" میں فرشتوں کی تقدیس سے مراد اللہ تعالےٰ کے لئے انکی نماز ہے۔ ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے

"نحن نسبح بحمدک و نقدس لک" کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ہم تیری عظمت اور بزرگی بیان کرتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو تجھے ناپسند ہو" قال انی اعلم ما لا تعلمون" (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اس آیت کے مفہوم کے سلسلہ میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ ابلیس کیطرف ہے جس نے پہلے ہی سے اپنے دل میں نافرمانی اور کفر چھپا رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ اس سے پوری طرح واقف تھا لیکن فرشتوں کے علم میں ابھی تک یہ باتیں نہیں آئی تھیں۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہی تفسیر ہے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے کئی روایتوں میں اور ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہی تفسیر منقول ہے لیکن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اشارہ ہونے والے نائب کیطرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے انکار پر فرمایا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے کہ اس نائب کی نسل سے بہت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنیوالے اور اس کے ولی پیدا ہوں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس نائب کی نسل میں انبیاء، رسول، قوم صالح اور جنتی پیدا ہونگے۔
آیت کے اس حصہ سے اس نقطہ نظر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ فرشتوں کا یہ انکار کہ "کیا تو زمین میں ایسے کو بنائیگا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا" محض اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اسے بہت اہمیت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی بھی مخلوق ہوگی جو خود اسکی نافرمانی کرے گی، جب اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ایسا ہی ہوگا تو انھیں اس پر بڑی حیرت ہوئی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" یعنی تمہیں اس پر حیرت ہے اور تم اسے اتنی اہمیت دے رہے ہو، حالانکہ خود تمہاری جماعت میں ایک ایسا فرد ہوگا جو یہی کریگا اور اس کے مقابلہ میں جس نائب پر تم اعتراض کر رہے ہو وہ خود اور اسکی نسل سے ایسے افراد نکلیں گے جن کی وہی صفات ہونگی جو تم نے اپنی صفات بیان کیں اور جو اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ کیونکہ بنی آدم میں فرشتہ صفت انسانوں کی جماعتیں پیدا ہونے والی تھیں اور فرشتوں میں سے ابلیس کو راندہ درگاہ ہونا تھا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى

اور علم دیدیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو (انکو پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے

الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ

روبرو کردیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر

صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

تم سچے ہو فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہمکو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ ہمکو

عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ

آپ نے علم دیا بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا) حق تعالیٰ نے

اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ

ان کو ان چیزوں کے اسماء بتلا دو سو جب بتلا دیئے ان کو آدم نے ان چیزوں کے اسماء

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ

تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا نہ تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں

وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کر دیتے ہو اور جس بات کو دل میں رکھتے ہو

آدم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ رب العزت نے ملک الموت کو بھیجا تاکہ زمین میں سے ہر طرح کی اچھی بری مٹی لائیں پھر اس مٹی سے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اس لئے آپ کا نام آدم پڑا کہ آپ کی پیدائش "ادیم ارض" (زمین کے ظاہری اور اوپر کے حصہ) سے ہوئی تھی۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام کو ادیم ارض سے پیدا کیا گیا اس میں مٹی کا اچھا اور پاکیزہ حصہ بھی تھا اور خراب بھی یہی خصوصیات انکی اولاد میں بھی ملاحظہ کیجا سکتی ہیں کہ اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ آدم علیہ السلام کے نام رکھنے کے سلسلہ میں یہی وجہ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے۔ ابن مسعود، ابن عباس، اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں ہے کہ جب ملک الموت کو آدم علیہ السلام کی پیدائش کے لئے مٹی لانے کے لئے بھیجا گیا تو انھوں نے زمین سے ہر طرح کی مٹی اٹھائی اور سب کو ملا دیا۔ مٹی ایک جگہ سے نہیں لی گئی تھی۔ بلکہ مختلف مقامات سے مختلف انواع واقسام کی مٹی لی گئی تھی، سفید بھی، سرخ بھی اور سیاہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بنی آدم مختلف رنگ کے ہیں اور اسی لئے آپ کا نام آدم رکھا گیا کہ آپ کی مٹی "ادیم ارض" (زمین کے ظاہری اور اوپر کے حصہ) سے لی گئی تھی۔ اس روایت کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام ایک مٹھی مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، یہ مٹی زمین کے تمام حصوں سے لی گئی تھی۔ اسی لئے بنی آدم بھی مٹی کی خصوصیات کے مطابق ہیں، ان میں سرخ بھی ہیں، سفید بھی، سیاہ بھی اور درمیانی رنگ کے بھی۔ زمین چونکہ نرم زمین اور پہاڑ سب کو شامل ہے اس لئے بنو آدم میں بھی اچھے اور برے دونوں ہیں۔

اس تفسیر کی بنیاد پر "آدم" فعل آدم سے نکلا ہے اور اس طرح ابوالبشر آدم علیہ السلام کا نام بنا ہے، جیسے احمد، فعل احماد سے نکلا ہے اور اسعد افعل، اسعاد سے نکلا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ مجرور نہیں پڑھا جاتا۔

علم، آدم کا امتیاز "وعلم آدم الاسماء کلہا" (اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھلائے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ انھیں چیزوں کے نام تھے جو آج لوگوں میں معروف و مشہور ہیں، یعنی انسان، چوپایہ، زمین، نشیبی علاقہ، دریا، پہاڑ، گدھا اور اس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات کے نام۔ کئی روایتوں میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل ہوا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کل کے کل نام سکھائے تھے کہ یہ پہاڑ ہے، یہ دریا ہے یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں چیز ہے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں ناموں سے مراد فرشتوں کے نام ہیں (دوسری مخلوقات کے نہیں) اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد آدم علیہ السلام کی ذریت کے نام ہیں۔ مناسب اور زیادہ قرین صحت قول یہ ہے کہ ناموں سے مراد یہاں خود آدم علیہ السلام کی ذریت کے اور فرشتوں کے نام لئے جائیں، دوسری

مخلوقات کے نام مراد نہیں اس لئے کہ اللہ تعالٰی نے اس کے بعد فرمایا ہے کہ "ثم عرضھم علی الملائکۃ" (پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا) یعنی ان چیزوں کو جن چیزوں کے نام حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے تھے، اور عرب "ہُم" کی ضمیر سے (جو عرضھم میں ہے) صرف انسان اور فرشتے ہی مراد لیتے ہیں، اگر ان کے علاوہ دوسری مخلوقات کے لئے ضمیر استعمال کرنا ہوتی ہے تو "ھا" یا "ھُنّ" کی ضمیر استعمال کرتے ہیں، اگر انسانوں اور فرشتوں کے سوا دوسری مخلوقات مراد ہوتیں تو "عرضہا" یا "عرضھن" کہنا چاہئے تھا۔ اگرچہ بعض اوقات "ہم" کی ضمیر جانوروں کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور قرآن مجید میں بھی یہ استعمال موجود ہے، لیکن بہر حال چونکہ قاعدہ اور کلام عرب میں عام استعمال اس کے مطابق ہے جس کی تشریح ہم نے پہلے کی، اس لئے مناسب تفسیر ہمارے نزدیک یہی ہے کہ ناموں سے مراد بنی آدم اور فرشتوں کے نام لئے جائیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں "عرضھم" کے بجائے "عرضھن" ہے اور اُبی رضی اللہ عنہ کی قرات میں "عرضہا" ہے، اور غالباً ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو اس سے مراد تمام مخلوقات، ہر نوع کی لی ہیں، اس کی بنیاد بھی قرات ہے، کیونکہ آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ آپ اُبی رضی اللہ عنہ کی قرات کے مطابق تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس بنیاد پر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر بھی کلام عرب کے عام اور معروف و مشہور استعمال کے مطابق ہوگی۔ "ثم عرضھم علی الملائکۃ" (پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا) جس بنیاد پر "علم آدم الاسماء" کی تفسیر کے سلسلہ میں مفسرین کے مختلف اقوال تھے۔ "ثم عرضھم علی الملائکۃ" کی تفسیر میں بھی اختلافات ہیں چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مطلب یہ ہے پھر مخلوقات کی تمام انواع کے ان تمام ناموں کو جو آدم علیہ السلام کو اللہ تعالٰی نے سکھائے تھے فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ لیکن ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے کہ آدم علیہ السلام کی تمام نسل کے ناموں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ جن کے وہ نام تھے ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام سکھادیئے اور الگ الگ ہر مخلوق کو ان کے سامنے لاکر ان کے نام بتائے" فقال انبئونی باسماء ہؤلاء" (پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے نام) انبئونی، اخبرونی کے معنی میں ہے (مجھے خبر دو، بتاؤ) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی معنی منقول ہیں "باسماء ہؤلاء" مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کا مفہوم ہے "جن کے نام آدم علیہ السلام کو بتائے گئے ہیں "ان کنتم صادقین" کی تفسیر میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ "اگر تم جانتے ہو کہ میں نے زمین پر کوئی نائب نہیں بنایا ہے" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ سے اس آیت کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ "اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ بنی آدم زمین پر فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے" حضرت حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما سے یہ مفہوم روایت ہے کہ اللہ تعالٰی نے فرشتوں سے فرمایا، اگر یہی واقعہ ہے کہ میں نے جو مخلوق بھی پیدا کی، تم اس کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے تو ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو" میرا خیال ہے کہ ان تمام اقوال میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول زیادہ صحیح ہے۔ یعنی اللہ تعالٰی نے فرشتوں سے فرمایا کہ تم نے جو یہ کہا ہے کہ "کیا تو زمین میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا" اور ہم تیرے حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں" تو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اگر میں نے تمہارے سوا کسی اور مخلوق کو زمین پر اپنا نائب بنایا تو اس کی نسل میری نافرمانی کرے گی، فساد برپا

کرے گی اور خون بہائے گی، اور اگر میں نے تمہیں نائب بنادیا تو تم میری اطاعت کروگے اور میرے حکم کی پیروی کروگے۔ پس جب تم ان چیزوں کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہو جنھیں میں نے تمہارے سامنے پیش کیا، حالانکہ وہ میری مخلوق ہیں اور تم انھیں دیکھتے رہے ہو، بلکہ تمہارے علاوہ ایک دوسری مخلوق نے میرے سکھانے کے بعد ان ناموں کو تمہیں بتادیا ہے، تو جو امور ابھی موجود و مخلوق نہیں ہوئے ہیں ان کے متعلق تم کیا جانو گے اس لئے ایسے معاملات میں کچھ نہ بولو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ جو مصالح تم سے اور میری تمام دوسری مخلوقات سے متعلق ہیں ان کا علم مجھے پوری طرح ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فرشتوں سے یہ ارشاد عتاب کے طور پر تھا۔ جیسے نوح ؑ پر اللہ تعالےٰ نے عتاب کیا تھا۔" (طوفان نوح میں جب آپ کا بیٹا جو کافر تھا، ڈوبنے لگا تو) آپ نے اللہ تعالےٰ سے عرض کی تھی کہ" اے میرے رب! میرا بیٹا بھی میرے اہل میں سے ہے، اور تیرا وعدہ حق ہے اور تو احکم الحاکمین ہے، (اللہ تعالےٰ نے فرمایا) ہرگز مت سوال کر اس کے بارے میں جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے، میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں تو نہ ہو جائے نادانوں میں سے، فرشتوں سے خطاب بھی اسی نوعیت کا تھا۔ چنانچہ جس طرح نوح علیہ السلام نے اس عتاب کے بعد فوراً رجوع کیا تھا کہ" اے میرے رب! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ آپ سے سوال کروں اس چیز کا جس کا مجھے علم نہیں، اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں ہو جاؤنگا نقصان والوں میں سے۔" اسی طرح فرشتوں نے بھی اس عتاب الٰہی کے بعد فوراً رجوع کیا اور توبہ کی،" فرشتوں نے کہا، پاک ہے تیری ذات ہمیں کوئی علم نہیں سوا اس کے جو تو نے سکھادیا" جس کسی کو بھی حق کی توفیق نصیب ہوتی ہے وہ اپنی کسی بھی غلطی پر، ظاہر ہو جانے کے بعد، یونہی رجوع اور توبہ کرتا ہے۔" قالوا سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العزیز الحکیم۔" (فرشتے بولے، پاک ہے تیری ذات، ہمیں تو کچھ علم نہیں، مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دیدیا، بیشک تو بڑا علم والا حکمت والا ہے) اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اطلاع دی ہے کہ اپنی غلطی کے واضح ہوتے ہی فوراً فرشتوں نے رجوع کیا کہ ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جو تو نے ہمیں سکھادیا ہے اور اللہ تعالےٰ کی پاکی بیان کی کہ آپ کے سکھائے بغیر کوئی شخص کسی چیز کا علم نہیں رکھ سکتا۔

بنی اسرائیل سن لیں ان تین آیتوں میں خاص طور سے بنی اسرائیل کے لئے جنکی ایک بڑی تعداد اس وقت مدینہ میں موجود تھی، عبرت و نصیحت ہے کہ ان کو اللہ تعالےٰ نے ان علوم غیب کی اطلاع دی ہے جو انبیاء اور اللہ کے خاص بندوں کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ جب تک خود اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان چیزوں کی اطلاع نہ دیجائے کوئی ان کے متعلق کیا جان سکتا ہے۔ بنی اسرائیل اس سے واقف تھے اس لئے یہ آیتیں آنحضور ؐ کی صداقت اور آپ کی نبوت کے حق ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ان کی روشنی میں وہ سمجھ سکتے تھے کہ آنحضور ؐ جو شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں وہ واقعی اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے۔

توبہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے" سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا" کی تفسیر کے سلسلہ میں روایت ہے کہ" سبحانک" فرشتوں نے اللہ کی پاکی بیان کرنے کے لئے کہا تھا، یعنی اس سے تیری ذات پاک ہے کہ کوئی تیرے سوا علم غیب رکھتا ہو، ہم تیری بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں۔" لاعلم لنا الا ما علمتنا" ہمیں تو کچھ علم نہیں لیکن ہاں وہ جو تو نے ہمیں سکھایا" یہ فرشتوں کیطرف سے برات کا اظہار ہے کہ وہ غیب کا علم صرف اسی قدر جانتے ہیں جو اللہ نے انھیں سکھایا ہے، جیسے آدم علیہ السلام کو اللہ نے سکھایا تھا۔" انک انت العلیم الحکیم" یعنی تو ہی

اے ہمارے رب! ذاتی طور پر ہر اس چیز کو جانتا ہے جو ہو چکی اور جو آئندہ ہو گی۔ فرشتوں نے پہلے اپنے علم کی نفی کی کہ ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں بتایا ہے پھر تمام علوم غیب کا اللہ تعالےٰ کے لئے اثبات کیا کہ "انک انت العلیم الحکیم"، یعنی بغیر کسی کے بتلائے ہوئے، سکھائے ہوئے تو ہی علم غیب کا جاننے والا ہے، تو ہی حکمت والا ہے۔ تیرے علاوہ جو بھی کچھ علم رکھتا ہے وہ بالواسطہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "علیم" وہ ذات ہے جو اپنے علم میں کامل ہو، اور "حکیم" وہ ذات جو اپنی قوت فیصلہ میں کامل ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "حکیم"، حاکم کے معنی میں ہے، جیسے علیم، عالم کے معنے میں اور خبیر، خابر کے معنی ہیں۔

خدا کی مصلحتیں

"قال یا ادم انبئہم باسمائہم فلما انباھم باسمائہم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض" (اللہ نے فرمایا، اے آدم! انھیں ان کے نام بتاؤ پھر آدم نے جب انھیں ان کے نام بتائے تو فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں) اس آیت میں اللہ تعالےٰ فرشتوں پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ زمین پر نائب بننے کے وہ زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ان کے اندر اللہ کے حکم کے لئے تسلیم و رضا ہے، وہ طاعت اور عبادت کرتے رہتے ہیں، لیکن جس مخلوق کو اللہ نائب بنانا چاہتا ہے وہ زمین میں فساد برپا کریگی اور اس میں خون بہائے گی، محض اللہ کی تدبیر اور فیصلہ کے مواقع سے لاعلمی کا نتیجہ ہے انھیں اس سلسلہ میں ابھی کوئی علم نہیں ہے، جس طرح ان چیزوں کے نام وہ نہیں جانتے جو ان کے سامنے پیش کی گئیں، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس کے متعلق بھی انھیں علم نہیں دیا تھا۔ یعنی کوئی بھی مخلوق اتنا ہی جان سکتی ہے جتنا علم اللہ تعالےٰ اسے دینا چاہیں۔ اللہ تعالےٰ نے کسی بھی مخلوق کو تمام چیزوں کا علم نہیں دیا، بلکہ ہر مخلوق کے مناسب اور اسکی ضروریات کے لحاظ سے اسے علم دیا، جیسے آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کے نام سکھلائے جو فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں تھیں۔ "یا آدم انبئہم" میں ہم کی ضمیر ملائکہ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اے آدم فرشتوں کو بتا دیجئے۔ "باسمائہم" یعنی ان چیزوں کے نام جو فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں ہیں، اس میں "ہم" کی ضمیر سے ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اس سے پہلے "انبئونی باسماء ہولاء" (مجھے بتاؤ ان کے نام) میں ہو چکا ہے۔ "فلما انبأہم" یعنی پھر جب آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دیئے جو ان کے سامنے پیش کی گئی تھیں اور فرشتے ان کے نام نہیں جان سکے تھے تو ان کے رب نے ان سے کہا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمان اور زمین کی چھپی ہو چیزوں کو جانتا ہوں۔ "الم اقل لکم انی اعلم غیب السموٰت والارض"، میں غیب سے مراد وہ چیز ہے جو نظروں سے پوشیدہ ہو اور کوئی اسے نہ دیکھ سکتا ہو۔ یہ جملہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے توبیخ کے طور پر کہا تھا کہ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جس کے متعلق انھیں علم نہیں تھا۔ آیت کی تفسیر اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے آدم اور ملائکہ کے واقعہ کے سلسلہ میں روایت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا، جس طرح تم ان چیزوں کے نام سے واقف نہیں ہو، کیونکہ تمہیں ان کا علم نہیں دیا، اسی طرح میں نے تم سے آدم کے متعلق یہ بات بھی چھپالی تھی کہ میں اسکی نسل سے ایسے لوگ بھی پیدا کروں گا جو میری نافرمانی کریں گے اور ایسے بھی پیدا کرونگا جو میری فرمانبرداری کریں گے۔ بیان کیا کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ "میں جہنم کو انسانوں اور جنوں سب سے بھر دونگا" بیان کیا کہ فرشتوں کو اس کا علم نہیں تھا اور نہ انھیں اس کا خیال تھا۔ پھر جب انھوں نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو علم عطا فرمایا ہے تو اس کے بعد انھوں نے آدم علیہ السلام کی فضیلت کو بھی تسلیم

کرلیا۔

ظاہر و پوشیدہ کا جاننے والا

"واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون" (اور جانتا ہوں وہ جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جو چھپاتے ہو) اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "جس طرح میں تمہارے ظاہر کو جانتا ہوں اسی طرح وہ بھی جانتا ہوں جو تم نے چھپا رکھا ہے۔ اس سے اشارہ ابلیس کیطرف تھا جس کے دل و دماغ میں کبر و غرور پہلے ہی سے پرورش پا رہا تھا۔ ایک دوسری روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ سے منقول ہے کہ "کیا بنائے گا تو زمین میں اسکو جو اسمیں فساد برپا کرے گا" تو وہ ہے جو انھوں نے ظاہر کیا تھا۔ "اور وہ جو تم چھپاتے ہو" سے اشارہ ابلیس کے غرور کیطرف ہے جو اس نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ سعید بن جبیر اور سفیان رحمہما اللہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔ لیکن مہدی بن میمون کی روایت میں ہے کہ ہم حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، حسن بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے پوچھا، اے ابوسعید! اللہ تعالٰے کے ارشاد "واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فرشتوں نے کونسی بات چھپائی تھی؟ آپ نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالٰے نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں نے دیکھا کہ ایک عجیب مخلوق پیدا ہوئی ہے ان کے دل میں اس سے کچھ خلجان پیدا ہوا اور انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کے متعلق گفتگو کی، انھوں نے آپس میں کہا کہ اس مخلوق کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے، اب تک تو اللہ تعالٰے نے مخلوق بھی پیدا کی ہمیں اس سے افضل واکرم رکھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول روایت ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فرشتوں نے ظاہر تو یہ کیا تھا کہ "کیا تو زمین میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا" لیکن آپس کی یہ بات چھپائی تھی کہ "اللہ تعالٰے نے اب تک جو مخلوق بھی پیدا کی ہمیں اس سے افضل رکھا" اس کے بعد انھیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالٰے نے آدم علیہ السلام کو علم و کرم میں ملائکہ پر فضیلت دی ہے، لیکن اپنی یہ بات انھوں نے کسی پر ظاہر نہیں کی۔ میرے نزدیک زیادہ بہتر تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں دو ہی اقوال موجود ہیں، ایک ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اور دوسرا حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کی صحت پر دلیل قرآن مجید کی یہ اطلاع ہے کہ ابلیس نے سرکشی کی تھی اور آدم علیہ السلام کو سجدہ سے انکار کیا تھا لیکن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں فرشتوں کی جس خفیہ گفتگو کے متعلق کہا گیا وہ نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ کسی حدیث سے۔ عربی محاورے میں یہ طریقہ بہت عام اور معروف ہے کہ اگر کسی جماعت کا ایک فرد بھی کوئی فعل کرتا ہے تو گفتگو میں اس فعل کی نسبت تمام جماعت کی طرف کرتے ہیں، اس لئے ابلیس نے جو غرور اور نافرمانی چھپا رکھی تھی اسے جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کرنا، اسی عربی محاورے کی بنیاد پر ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ

اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں سے اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم

اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
رہا کرو تم اور تمہاری بی بی بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے

شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ o
چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص
پھر لغزش دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کیوجہ سے سو برطرف کرکے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ
اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو سرزمین پر چندے ٹھہرنا ہے

مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ o 5352
اور کام چلانا ایک میعاد معین تک

اور ابلیس نے انکار کر دیا

"اذ قلنا" کا عطف (اس سے پہلے کی آیت) "واذ قال ربک للملائکۃ" پر ہے، اللہ تعالیٰ ان یہود کو جو مدینہ میں موجود تھے، تنبیہ کرتا ہے کہ میری نعمتوں اور میرے احسانات کو یاد کرو۔ اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے احسانات ہی کا تذکرہ تھا کہ میں نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں، اور جب میں نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں، تو میں نے تمہارے جدامجد آدم علیہ السلام کو اپنے پاس سے علم و فضل دیکر عزت بخشی تھی، میں نے فرشتوں سے انھیں سجدہ کرنے کے لئے کہا اور انھوں نے میرے حکم کے مطابق سجدہ کیا۔ پھر تمام فرشتوں میں سے ابلیس کو مستثنیٰ قرار دیا (کہ اس نے سجدہ نہیں کیا) ابلیس کا فرشتوں کی جماعت سے استثناء بتاتا ہے کہ یہ بھی انھیں میں کا ایک فرد تھا اور ان کے ساتھ اسے بھی سجدہ کا حکم ہوا تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کو سجدہ کا جو حکم ہوا تھا اس کا مخاطب ابلیس بھی تھا۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے انکار کر دیا۔

کیا ابلیس فرشتہ تھا؟

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ ابلیس بھی فرشتوں میں سے تھا یا اس کا تعلق کسی دوسری مخلوق سے تھا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابلیس فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت کا فرد تھا، فرشتوں کی اس جماعت کو جن کہتے تھے۔ یہ جماعت جھلسا دینے والی آگ سے پیدا کی گئی۔ ابلیس کا نام حارث تھا اور جنت کے بہت سے داروغے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ بیان کیا کہ فرشتوں کی اس جماعت کے سوا دوسری تمام جماعتیں نور سے پیدا کی گئیں تھیں۔ جن "جنات" کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے (اور جو ایک الگ مخلوق ہیں) وہ آگ کی لپٹ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں ہے کہ معصیت سے پہلے ابلیس فرشتوں میں سے تھا، اس کا نام عزازیل تھا، یہ ان فرشتوں میں سے تھا جو زمین

پر رہا کرتے تھے۔ عبادت وریاضت اور علم میں دوسرے فرشتوں سے بڑھکر تھا۔ اس چیز نے اس کے دل میں کبر و غرور پیدا کر دیا۔ اس کا تعلق فرشتوں کی جس جماعت سے تھا انھیں "جن" کہتے تھے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں ہے کہ فرشتوں میں اسے بہت عزت حاصل تھی اسے آسمان دنیا اور دنیا کے نگراں کی حیثیت سے مامور کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ جنت کی نگرانی بھی اس کے سپرد تھی جنت کی نگرانی کیوجہ سے اسے "جن" کہتے تھے، جیسے (مکہ اور مدینہ وغیرہ کیطرف نسبت کر کے) مکی، مدنی، کوفی، اور بصری کہتے ہیں۔ ضحاک بن مزاحم، سعید بن مسیب، قتادہ اور محمد بن اسحٰق رحمہم اللہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے کہ ابلیس فرشتوں کی ایک مخصوص جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ دعوی قطعًا قابل قبول نہیں کہ ابلیس فرشتوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ جس طرح آدم علیہ السلام انسانوں کے ابوالآباء ہیں اسی طرح ابلیس جنوں کا ابوالآباء ہے۔

سعد بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ فرشتے جنوں سے جنگ کرتے تھے اس جنگ کے نتیجہ میں ابلیس قیدی کی حیثیت سے لایا گیا تھا اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا۔ پھر یہ فرشتوں کے ساتھ رہنے لگا ان کے ساتھ عبادت کیا کرتا تھا جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کا حکم ہوا تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے انکار کیا اسی لئے اللہ تو نے فرمایا ہے کہ، "الا ابلیس کان من الجن" (لیکن ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا اور وہ جنوں میں سے تھا) ابوزید رحمۃ اللہ علیہ سے، بھی ایک روایت میں ہے کہ ابلیس جنوں کا ابوالآباء ہے، جس طرح آدم علیہ السلام انسانوں کے ہیں۔

جن مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا اسکی ایک وجہ ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں، خود فرمایا ہے کہ ابلیس کی پیدائش جھلسا دینے والی آگ سے ہوئی ہے۔ لیکن فرشتوں کے متعلق کہیں نہیں فرمایا کہ وہ بھی اس طرح کی کسی چیز سے پیدا کئے گئے (بلکہ صراحت ہے کہ وہ نور سے پیدا ہوئے ہیں)، اس کے علاوہ اللہ تعالی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ابلیس جنوں میں سے تھا" اس لئے ان حضرات نے فرمایا کہ یہ قطعًا جائز ومناسب نہیں، کہ ابلیس کی نسبت جس طرف خود اللہ تعالی نے کر دی، ہم اس کے سوا کسی اور طرف اسکی نسبت کریں، پھر ابلیس کی نسل و اولاد کا سلسلہ بھی چلا اور معلوم ہے کہ فرشتوں میں توالد و تناسل نہیں لیکن اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کا تذکرہ بھی مناسب ہے، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اللہ تعالی نے ایک مخلوق پیدا کی اور انھیں حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں انھوں نے انکار کیا تو اللہ تعالی نے ان پر آگ بھیجی جس نے انھیں جلا دیا پھر دوسری مخلوق پیدا کی انھیں بھی حکم دیا اور جب انھوں نے بھی انکار کیا تو انپر آگ کو مسلط کیا جس نے انھیں جلا دیا۔ پھر ایک تیسری مخلوق پیدا کی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ ہم سجدہ کریں گے ابلیس کا تعلق اسی مخلوق سے تھا جس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی قابل انکار بات نہیں اگر اللہ تعالی نے فرشتوں کی مختلف قسموں کو مختلف عناصر سے پیدا کیا ہو بعض کو نور سے و بعض کو دوسرے عناصر سے اپنی مرضی و ارادہ کے مطابق، فرشتوں میں اور اسی طرح ابلیس کی پیدائش کے سلسلے میں قرآن مجید میں جو کچھ بھی ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ابلیس الگ کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتا تھا بلکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی نے فرشتوں کی کوئی جماعت آگ سے پیدا کی ہو اور ابلیس کا تعلق بھی اسی جماعت سے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف ابلیس کو جھلس دینے والی آگ سے پیدا کیا ہو، دوسرے تمام فرشتوں کو اس سے نہ پیدا کیا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں کی کوئی خاص قسم ایسی پیدا کی گئی ہو جس میں توالد و تناسل کی صلاحیت ہو۔ خاص طور سے اس وجہ سے بھی انھیں شہوت و لذت کا احساس دیا گیا ہو کہ انکی طرف سے معصیت و نافرمانی اللہ تعالی کے علم میں

پہلے ہی سے تھی، اور دوسرے فرشتوں کو شہوت اور توالد وتناسل کی صلاحیت نہ دی گئی ہو، اللہ تعالےٰ نے جواس کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ وہ "جن" میں سے تھا تو اسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے جن اس لئے کہا گیا ہو کہ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر اس چیز کو جو دکھائی نہ دے اور نظروں سے پوشیدہ رہے جن کہہ سکتے ہیں، اس طرح ابلیس اور دوسرے تمام فرشتوں کو جن کہہ سکتے ہیں کہ وہ بنی آدم کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

تشریح طلب الفاظ

ابلیس، اِفعیل کے وزن پر (فعل) "ابلاس" سے نکلا ہے۔ ابلاس کے معنی "خیر سے مایوسی، شرمندگی اور حزن وغم" ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کہ ابلیس کو اللہ تعالےٰ نے ہر طرح کی خیر و بھلائی سے مایوس کر دیا تھا اور اسے اسکی نافرمانی کی سزا کے طور پر شیطان بنا دیا تھا۔ سُدّی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ ابلیس کا اصل نام حارث تھا، لیکن جب اسے رحمت سے مایوس کر دیا گیا تو اس کا نام ابلیس پڑ گیا، جیسے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے "فاذا هم مبلسون" (ابلاس سے) یعنی خیر و بھلائی سے وہ ناامید و مایوس تھے، نادم اور غمگین تھے۔ لفظ "ابیٰ" سے اللہ تعالےٰ نے یہ مراد لیا ہے کہ ابلیس آدم علیہ السلام کو سجدہ سے رک گیا اور انھیں سجدہ نہیں کیا" واستکبر" یعنی اپنے کو بڑا سمجھا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کے سلسلہ میں اللہ تعالےٰ کی فرمانبرداری میں اپنی توہین محسوس کی۔

نصیحت وعبرت

ان آیات میں اگرچہ محض ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت اس واقعہ میں اللہ تعالےٰ کے ان بندوں کے لئے عبرت ونصیحت ہے جو ابلیس کیطرح اللہ تعالےٰ کے احکام کی اطاعت و فرمانبرداری اور اس کے سامنے جھکنے میں کبر و غرور محسوس کرتے ہیں اور جو حقوق اللہ تعالےٰ نے انسانوں کے باہمی معاملات کے لئے مقرر کر دیئے ہیں اسے نہیں مانتے اور اس کے فیصلہ کے خلاف عمل کرتے ہیں، اللہ کے حکم کے سامنے جھکنے، اسکی اطاعت و فرمانبرداری اور حقوق کے سلسلہ میں اس کے فیصلوں کو ماننے سے جن لوگوں نے تکبر وانکار کیا تھا ان میں وہ یہودی بھی تھے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مدینہ میں آباد تھے، خاص طور سے ان کے علماء، جو حضور اکرم اور آپ کی صفات سے خوب واقف تھے۔ اس موقعہ پر ابلیس کی سرکشی اور اس کے کفر وانکار کے ذکر میں یہودیوں کے لئے خاص طور سے تنبیہ ہے کہ جس طرح سب کچھ جانتے ہوئے ابلیس نے محض کبر و غرور اور حسد کیوجہ سے انکار کیا تھا اور اللہ تعالےٰ کے احسانات کی ناشکری کی تھی، اسی طرح اپنی پوری تاریخ میں یہودیوں نے اللہ تعالےٰ کی ناشکری کی، انھیں کھانے کے لئے اللہ کی طرف سے من وسلویٰ ملا، اسکی ناشکری کی، ان پر بادلوں نے سایہ کئے رکھا، اسکی ناشکری کی، اور انکی ناشکری اور کفران نعمت کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ خاص طور سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات اور علامات نبوت کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد آپ کی نبوت سے محض حسد اور غرور کی وجہ سے انکار کیا اس لئے اللہ تعالےٰ نے ابلیس کے انکار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "وکان من الکافرین" (یعنی ہو گیا وہ منکروں میں سے) یعنی جس طرح یہودی منکر ہیں، اسی طرح وہ بھی ہے، اور ابلیس اپنے انکار کیوجہ سے منکروں کی اس جماعت میں شامل ہے۔ یہودی انسان ہیں، اس لئے ابلیس پیدائش میں ان سے مختلف ہے لیکن ہے انھیں کیطرح۔ منافقین کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے کہ "بعضهم من بعض" (ان میں کے بعض بعض میں سے ہیں)، اگرچہ ان میں کا ہر فرد الگ الگ اپنا وجود رکھتا۔ لیکن یہاں مطلب یہ ہے کہ نفاق و گمراہی میں وہ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح ابلیس کے متعلق بھی فرمایا کہ "کان من الکافرین" یعنی اللہ کے حکم کی مخالفت اور کفر کیوجہ سے کافرین (یہود) کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ آیت میں "الکافرین" کا مفہوم ہے

"العاصین" (نافرمانوں، گنہ گاروں) میں سے ہو گیا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آدم کو ملائکہ کا سجدہ اللہ تعالےٰ کی عبادت تھی۔ کیونکہ یہ اللہ کا حکم تھا، اور اس سجدہ سے اللہ تعالیٰ کا مقصد آدم علیہ السلام کی عزت افزائی اور اکرام تھا، ان کی عبادت کرانی مقصود نہیں تھی۔

آدم علیہ السلام جنت میں

"وقلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ" (اور ہم نے کہا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو سہو) آیت کا یہ ٹکڑا واضح طور پر دلالت کرتا ہے کہ اس اظہار غرور کے بعد ابلیس جنت سے نکالدیا گیا تھا اور ابلیس کے زمین پر آنے سے پہلے آدم علیہ السلام جنت میں ٹھیرائے گئے تھے۔ زیر تفسیر آیت کا ترجمہ پڑھ لیجیے، وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس نے، اظہار کبر و غرور اور اس کے نتیجہ میں راندۂ درگاہ ہونے کے بعد، آدم علیہ السلام اور انکی بیوی کو اللہ کی اطاعت کے خلاف پھسلایا تھا۔ کیونکہ باقی تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ ان کے اندر روح پھونکے جانے کے بعد کیا تھا اور ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا تھا اور اس انکار کے نتیجہ میں اس پر لعنت ہوئی تھی۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ابلیس نے اللہ کی عزت اور غلبہ کی قسم کھائی تھی کہ آدم، انکی بیوی اور ان کی نسل کو گمراہ کرونگا۔ جب اس پر اللہ کی لعنت ہو چکی، جنت سے نکالا جا چکا، اگرچہ ابھی زمین پر نہیں اترا تھا، اور جب اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام بتادیئے تب اس نے یہ قسم کھائی تھی۔ اسی طرح کی ایک روایت ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے۔

حوّا علیہا السلام

اس سلسلہ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں کہ آدم علیہ السلام کے لئے انکی بیوی کو کس حالت میں پیدا کیا گیا تھا؟ اور کس وقت جنت ایکے قیام کی جگہ قرار پائی تھی؟

ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے روایت ہے کہ جب ابلیس پر اللہ کی لعنت ہوئی تو اسے جنت سے نکالدیا گیا اور آدم علیہ السلام کو اس میں ٹھیرایا گیا۔ لیکن اسمیں رہتے ہوئے انہیں وحشت ہوتی تھی، کیونکہ ان کا کوئی جوڑا نہیں تھا جس سے وہ سکون حاصل کرتے۔ پھر ایک مرتبہ وہ سوئے، اور جب جاگے تو ایک عورت کو اپنے سرہانے بیٹھا دیکھا، اللہ تعالےٰ نے انھیں آپ کی پسلی کی ہڈی سے پیدا کیا تھا۔ آدم علیہ السلام نے ان سے پوچھا، آپ کی تعریف؟ کہا میں عورت ہوں، پوچھا آپ کی پیدائش کس مقصد کے لئے ہوئی ہے؟ کہا، تاکہ آپ مجھ سے سکون حاصل کریں۔ فرشتے وہیں موجود تھے، انھیں خیال ہوا کہ آدم علیہ السلام کو ان کا نام ابھی معلوم نہیں ہوگا، اس لئے پوچھ بیٹھے۔ آدم! ان کا نام کیا ہے؟ فرمایا کہ حوّا۔ اب فرشتوں نے پوچھا، ان کا نام حوّا کیوں پڑا؟ فرمایا کیونکہ یہ ایک زندہ مخلوق سے پیدا کی گئی ہیں، پھر اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں ٹھہرو، اور اس میں جہاں سے جی چاہے خوب کھاؤ پیو

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حوا علیہا السلام کی پیدائش، آدم علیہ السلام کے جنت میں قیام کے بعد ہوئی تھی۔ لیکن ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش جنت میں جانے سے پہلے ہوئی ہے۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ابلیس پر عتاب کے بعد آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوا، پہلے آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے تھے۔ اب آپ سے فرمایا کہ اے آدم! انھیں ان چیزوں کے نام بتادو۔ بیان کیا کہ جیسا کہ تمہیں یہودی اہل کتاب اور دوسرے علماء، ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے معلوم ہوا ہے، پھر آدم علیہ السلام پر اونگھ طاری کی گئی اور آپکی بائیں طرف کی کوئی پسلی نکالی گئی۔ آدم علیہ السلام اسوقت بھی سوتے رہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے انکی پسلی سے انکی بیوی حوّا علیہا السلام کو پیدا کرلیا اور پوری عورت انھیں بنادیا تاکہ ان سے سکون حاصل کریں، تب آدم علیہ السلام بیدار ہوئے

جب اونگھ کی کیفیت ختم ہوئی اور آپ نیند سے جاگے تو دیکھا کہ وہ ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے، لیکن علماء یہود وغیرہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام نے کہا، میرا خون میرا گوشت اور میری بیوی! پھر آپ کو ان سے سکون ملا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حوا علیہا السلام سے انکی شادی کردی اور خود آپ کے لئے انھیں باعث سکون بنادیا تو فرمایا، اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو سہو اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ تم گنہ گاروں میں سے ہوجاؤ گے۔ بیوی کو زوج بھی کہتے ہیں اور زوجۃ بھی، اگرچہ اکثر اسکے لئے کلام عرب میں "زوجۃ" ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن شوہر کے لئے صرف زوج استعمال ہوتا ہے۔

"وکلا منھا رغدًا حیث شئتما" (اور اس میں سے جہاں سے چاہو خوب کھاؤ) زندگی کی ضروریات جب پوری فراخی اور وسعت کے ساتھ مہیا ہوں اور آدمی کو کسی قسم کی فکر نہ ہو تو اسکے لئے عربی میں "رغدا" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "کلا منہا رغدًا" میں رغد کا مفہوم ہے خوب فراخی اور وسعت۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "رغدًا" کا مفہوم ہے کہ ان سے کسی قسم کا حساب نہیں لیا جائیگا اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ہم نے کہا، اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو سہو اور اس میں پوری فراخی اور آرام کے ساتھ جہاں سے چاہو کھاؤ"۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ اجازت اللہ تعالیٰ نے انھیں دی تھی کہ جہاں سے چاہیں خوب کھائیں، لیکن جو آزمائش تمام مخلوقات کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے اس سے انھیں بھی دوچار ہونا تھا۔ چنانچہ انھیں جنت کے ایک درخت کے کھانے سے منع کردیا اور اسی میں آپ مبتلا ہوگئے۔

شجرہ؟ "ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ" (اور اس درخت کے قریب نہ جانا) "شجرۃ" کلام عرب میں ہر اس درخت کو کہتے ہیں جو تنے پر کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَالنجمُ وَالشّجر یسجدان" (اور نجم اور شجر دونوں سجدہ کرتے ہیں) میں بھی "نجم" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو زمین سے بیل کے طریقہ پر اگتی اور بڑھتی ہیں۔ اور "شجر" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو تنے پر کھڑی رہتی ہیں۔ مفسرین کے اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں کہ یہاں "شجرہ" سے کیا مراد ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ شجرہ جس کا پھل کھانے سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو روکا تھا وہ گیہوں کا پودا تھا۔ ابو مالک، ابو عطیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے بھی یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابو الخلد کو خط لکھکر اس درخت کے بارے میں پوچھا جو آدم علیہ السلام نے کھایا تھا (مخالفت کے باوجود) اور اس درخت کے متعلق بھی جہاں آپ نے توبہ کی تھی۔ ابو الخلد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے اس درخت کے بارے میں سوال کیا جس سے آدم علیہ السلام کو روکا گیا تھا، تو وہ گیہوں کا درخت ہے، اور آپ نے مجھ سے اس درخت کے بارے میں بھی پوچھا ہے جہاں آپ نے توبہ کی تھی تو وہ زیتون کا درخت ہے۔ وہب بن منبہ یمانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ گیہوں تھا۔ لیکن جنت میں اس کا دانہ جھاگ سے زیادہ نرم اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اہل توراۃ بھی کہتے ہیں کہ وہ گیہوں ہے۔ حسن اور رفاعہ بن محارب رحمہما اللہ سے بھی گیہوں کی روایت ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جس درخت کا پھل کھانے کی ممانعت ہوئی تھی وہ انگور کا درخت تھا۔ چنانچہ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی متعدد روایتوں میں منقول ہے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ "لا تقربا ہٰذہ الشجرۃ" (اس درخت کے پاس نہ جانا) وہ انگور کا درخت تھا۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا۔ سدی، جعدہ بن ہبیرہ، سعید بن جبیر اور محمد بن قیس رحمہم اللہ سے یہی قول نقل ہوا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ "انجیر" کا درخت تھا،

ابن جریج رحمتہ اللہ علیہ بعض صحابہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ درخت انجیر کا تھا۔ لیکن اس آیت کی بہترین تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالے نے اپنے مخاطب بندوں کو صرف اتنی اطلاع دی ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام اور انکی بیوی حوا علیہا السلام کو جنت کے ایک متعین درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا، اشارہ کرکے بتا دیا تھا کہ" اس درخت کے پاس نہ جانا" لیکن دونوں حضرات سے غلطی ہوئی اور ممانعت کے باوجود انھوں نے اس درخت کا پھل کھالیا۔ اس کے بعد قرآن میں کہیں بھی اسکے لئے اشارہ تک نہیں کہ اس درخت کا نام کیا تھا۔ یا وہ درخت کس طرح کا تھا۔ صرف اتنا بتا یا گیا ہے کہ ایک خاص درخت تھا۔ اگر اللہ تعالے کے نزدیک اس خاص درخت کا علم بھی ہمارے لئے مناسب ہوتا تو ضرور اسکی نشاندہی کرتے یا اسکی طرف اشارہ ہی کر دیتے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم صرف اتنا کہیں کہ اللہ تعالے نے آدم اور انکی بیوی حوا علیہما السلام کو جنت کے ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے روکا تھا، تمام درختوں سے نہیں روکا تھا، پھر انھوں نے اسکی خلاف ورزی کی اور اس درخت کا پھل کھالیا۔ اسکے بعد اس درخت کے تعین کے لئے نہ قرآن مجید میں کوئی دلیل ہے اور نہ صحیح احادیث میں (اہل کتاب وغیرہ کی روایتوں کو دیکھکر) بعض مفسرین نے کہا کہ وہ گیہوں کا درخت تھا۔ کسی نے کہا کہ انگور کا درخت تھا اور کسی نے کہا کہ انجیر کا درخت تھا۔ ممکن ہے کہ انھیں میں سے کوئی درخت رہا ہو، لیکن اس کے جاننے سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اسے نہ جاننے سے کوئی نقصان ہے۔

" ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظّٰلمین" کی تشریح میں کوفہ کے بعض نحویوں نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم اس طرح ہوگا" اس درخت کے قریب نہ جانا، کیونکہ اگر تم اس کے قریب گئے تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے"۔ "فتکونا من الظالمین"، یعنی جس حد تک تمہیں اجازت دی گئی ہے اور تمہارے لئے مباح قرار دیا گیا ہے اس سے آگے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس درخت کے پاس گئے تو تم ان لوگوں کے راستہ پر ہو جاؤ گے جو میرے قائم کئے ہوئے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، میرے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں، اور میری حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرتے ہیں۔ "ظلم" کا اصل مفہوم کلام عرب میں "کسی چیز کو اس کے واقعی اور حقیقی مقام سے ہٹاکر کسی دوسری جگہ رکھ دینا ہے، اسی سے آتا ہے" ظلم الرجل جزورۃ"، اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص بلا کسی وجہ کے اپنی اونٹنی کو ذبح کر دے۔ اس کے علاوہ "ظلم" بہت سے مواقع پر استعمال ہوتا ہے اور ہم انشاءاللہ اگر موقع ہوا تو اس کے مفہوم کی مزید وضاحت کریں گے۔ بہرحال اصل سب کی وہی ہوگی جو ہم نے ظلم کے مفہوم کے سلسلے میں بیان کی کہ "کسی چیز کو اس کے حقیقی مقام کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا"۔

ابلیس کی کامیابی

" فازلھما الشیطٰن " ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس جملہ کی تفسیر میں روایت ہے کہ "شیطان نے ان دونوں کو گمراہ کر دیا"۔ بعض قاریوں نے "فازلّھما" لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ "زلّ الرّجل" سے ہے، اس وقت بولتے ہیں جب آدمی غلطی کرے اور ایسا کام کر دے جو اسے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ "ازلّ" افعال سے، اس کا مزید ہے) بولتے ہیں، "ازلّہ غیرہ"، جب کوئی دوسرا غلطی کے ارتکاب کا سبب بنے، خواہ دنیاوی غلطی ہو یا دینی۔ چنانچہ اللہ تعالے نے نکلوانے کی نسبت ابلیس کیطرف کی کہ اس نے آدم علیہ السلام اور انکی بیوی کو جنت سے نکلوا دیا۔ یہ اس لئے کہ وہی اس غلطی کا سبب بنا تھا جو جنت سے ان کے نکلنے کا باعث بنی۔ دوسرے قاریوں نے اسے "فَازَالَھما" پڑھا ہے" ازالۃ الشیٔ" سے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی چیز الگ ہو جائے۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح قرات" فازلّھما"، لام کے تشدید کے ساتھ ہے

اس لئے کہ اس کے فوراً بعد ہے" فاخرجہما مما کانا فیہ" (اور جس میں وہ تھے اس سے انھیں نکلوا دیا) "ازالہما" اگر پڑھا جائے تو اس کا خود یہی مفہوم ہے، پھر اس جملہ کے لانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی۔ ابلیس۔ آدم اور حوّا علیہما السلام کو اس غلطی میں مبتلا کرنے میں کس طرح کامیاب ہوا جو انھیں جنت سے نکالے جانے کا باعث بنی، اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام اور انکی بیوی کو جنت میں ٹھیرایا۔ اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کیا۔ اس درخت کی شاخیں آپس میں گتھی ہوئی تھیں اور اس کا پھل فرشتے کھاتے تھے، کیونکہ انھیں ہمیشہ زندہ رہنا تھا اسی درخت کا پھل کھانے سے اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام اور انکی بیوی کو منع کیا تھا۔ جب ابلیس نے انھیں پھسلانا چاہا تو سانپ کے پیٹ میں داخل ہو کر جنت میں گیا۔ سانپ کے اس وقت چار پاؤں تھے اور وہ بہت خوبصورت جانور تھا۔ جب سانپ جنت میں داخل ہو گیا تو وہ اس کے پیٹ سے باہر نکل آیا اور اس درخت کا جس کے کھانے سے اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو منع کیا تھا، پھل توڑ کر حوّا علیہا السلام کے پاس آیا اور بولا اس پھل کو بھی تو دیکھو، اسکی خوشبو کتنی خوشگوار اور مزہ کتنا لطیف اور رنگ کیسا ہی خوبصورت ہے۔ حوّا علیہا السلام نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور اس میں سے کھایا۔ پھر اسے لیکر خود آدم علیہ السلام کے پاس گئیں اور ان سے کہا، اس پھل کو بھی دیکھو خوشبو کتنی خوشگوار، مزہ کتنا لطیف اور رنگ کتنا خوبصورت ہے، آدم علیہ السلام نے بھی اسے کھا لیا۔ اب ان دونوں حضرات کی شرمگاہ ظاہر ہو گئی - آدم علیہ السلام درخت کے اندر داخل ہو گئے ان کے رب نے انھیں آواز دی، اے آدم! تم کہاں ہو؟ عرض کی، میں یہاں ہوں، اے میرے رب! فرمایا، کیوں باہر نہیں آ گئے؟ عرض کی، میرے رب! مجھے تجھ سے شرم آتی ہے۔ پھر درخت کے متعلق فرمایا تجھ پر ایسی لعنت ہو کہ تیرے پھل کانٹوں میں بدل جائیں۔ بیان کیا کہ اس وقت تک زمین یا جنت میں طلح اور بیر کے درخت سے زیادہ افضل اور کوئی درخت نہیں تھا۔ پھر فرمایا، حوّا تو نے میرے بندے کو بہکایا ہے اس لئے تیری تقدیر میں یہ لکھا جاتا ہے کہ جب بھی تجھے حمل ہو گا تو تو اس کا بوجھ محسوس کرتی رہے گی اور جب وضع حمل کا وقت آئے گا تو کئی بار موت کے منہ تک پہنچ جائے گی۔ اور سانپ سے فرمایا کہ میرے بندے کو گمراہ کرنے کے لئے تیرے ہی پیٹ میں ملعون داخل ہوا تھا۔ آج سے تجھ پر بھی لعنت ہے، ایسی لعنت کہ تیرے پاؤں تیرے پیٹ میں دھنس جائیں اور مٹی کے سوا تیری اور کوئی روزی باقی نہ رہے، تو انسانوں کا دشمن ہو اور انسان تیرے دشمن ہوں کہ اگر تو کسی آدمی کو دیکھ لے تو اس کا پیچھا کرے اور اگر کوئی انسان تجھے دیکھ لے تو تیرا سر کچل دے۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ فرشتے کیا کھاتے تھے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ شیطان، حوّا علیہا السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس درخت کے کھانے سے منع کیا گیا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں اس کے کھانے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ شیطان نے کہا تمہارے رب نے اس کے کھانے سے تمہیں صرف اسلئے منع کیا ہے کہ اگر تم نے کھا لیا تو تم فرشتہ ہو جاؤ گی، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ گی۔ بیان کیا کہ حوّا علیہا السلام اس کے فریب میں آ گئیں اور اس کا پھل کھا لیا۔ پھر آدم علیہ السلام سے انھوں نے کہا اور آپ نے بھی اس کا پھل کھا لیا۔ بیان کیا کہ وہ ایسا درخت تھا کہ جو بھی اس کا پھل کھاتا اسے پیشاب پاخانہ ہوتا اور جنت میں یہ چیزیں مناسب نہیں تھیں۔ بیان کیا کہ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ "شیطان نے ان دونوں حضرات کو جنت سے باہر کیا اور جس میں وہ قیام پذیر تھے اس سے نکالا۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ابلیس کا سب سے پہلا فریب یہ تھا کہ وہ

آدم و حوّا علیہما السلام کے سامنے بہت رویا اور گریہ و بکا کی۔ جب انھوں نے اس کا رونا پیٹنا سنا تو پوچھا تم کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا میں تم پر روتا ہوں، ایک دن تم مر جاؤ گے اور پھر یہ تمام نعمتیں تم سے چھن جائیں گی۔ یہ بات ان کے دل کو لگی۔ پھر موقع دیکھ کر وہ ان کے پاس آیا اور ان کے دل میں وسوسے ڈالنے لگا، کہا، آدم! تمہیں ایک ایسا درخت بتاؤں جو تمہارے ہمیشہ زندہ رہنے کی ضمانت ہوگا، پھر کہنے لگا، تمہارے رب نے تو تمہیں اس درخت کے کھانے سے منع ہی اس لئے کیا ہے تاکہ تم فرشتہ یا ہمیشہ رہنے والی مخلوق نہ بن جاؤ اور اس طرح شیطان نے انھیں فریب دیا۔ اسی طرح کی روایت ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہے۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علماء تورات بتاتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی گفتگو سانپ سے ہوئی تھی (جس میں ابلیس چھپا ہوا تھا) ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے خود اس نے براہ راست گفتگو کی تھی۔ ان تمام اقوال میں ہمارے نزدیک، حق وہی قول ہو سکتا ہے جو کتاب اللہ کے موافق ہو۔ اللہ تعالےٰ نے ابلیس کے متلق خود فرمایا ہے کہ اس نے آدم اور حوا علیہما السلام کو دھوکا دیا تاکہ ان کے سامنے انکی شرمگاہ کو ظاہر کردے، ان سے اس نے یہ بھی کہا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لئے منع کیا ہے تاکہ تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، اور یہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے کہ اس نے ان سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس کا مقصد ان دونوں حضرات سے محض خیر خواہی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد کہ ابلیس نے آدم و حوا علیہما السلام سے قسم کھا کر کہا کہ وہ صرف نصیحت اور خیر خواہی کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے، واضح طور پر بتاتا ہے کہ ابلیس نے براہ راست خود ان سے گفتگو کی تھی۔ اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ اپنی اصل شکل و صورت میں آکر اس نے ان سے گفتگو کی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسری مخلوق کی آڑ لی ہو، اگر ابلیس صرف انکی لغزش کا سبب بنا ہوتا، اور براہ راست دھوکا نہ دیا ہوتا تو کلام عرب میں اس کے لئے قسم کھانے کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ قرآن مجید میں ہے کہ "شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ پیدا کیا"، لیکن اگر اس وسوسہ کا مفہوم صرف اس حد تک تسلیم کیا جائے جیسے عام انسانوں کے دلوں میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ جس درخت سے اللہ تعالےٰ نے منع کیا تھا آدم علیہ السلام کے ذہن میں اسکی اچھائی اور خوبی اس نے ڈالی ہو، براہ راست گفتگو نہ کی ہو تو یہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس نے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کے لئے خیر خواہی کرنے والوں میں سے ہوں" اور یہ خلاف محاورہ ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے کرنے کا صرف سبب بنا ہو تو اس کے لئے قسم کھانے کا لفظ استعمال کیا جائے۔ آج اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ابلیس نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ یہ گناہ مجھے کر لینا چاہیئے میں تمہیں محض خیر خواہی کی وجہ سے مشورہ دے رہا ہوں"۔ اسی طرح اگر آدم اور حوّا علیہما السلام کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہوتی جیسے عام انسانوں کی لغزشوں اور غلطیوں میں ہوتی ہے تو قسم کھانے کا لفظ استعمال نہ ہوتا اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ شیطان نے کہا تھا کہ میں تمہاری خیر خواہی کے لئے تمہیں اس کا مشورہ دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ محاورہ کے خلاف ہوتا۔ اس لئے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ابلیس نے ان سے براہ راست ہی گفتگو کی تھی۔ یہ سوال کہ ابلیس کو اللہ تعالےٰ نے جنت سے نکال دیا تھا اور اسے راندۂ درگاہ قرار دے دیا تھا پھر وہ جنت میں کیسے داخل ہوا؟ تو جو کچھ اس سلسلے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے عقل کی روشنی میں رد کیا جا سکے، بہر حال جو کچھ ان روایتوں میں کہا گیا وہ ممکن ہے اور اتنا تو اللہ تعالےٰ کے ارشاد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدم علیہ السلام تک پہنچا تھا اور ان سے گفتگو کی تھی۔ اس لئے ممکن ہے

کہ جنت میں وہ اس صورت سے پہنچا ہو جس کی نشاندہی مفسرین نے کی ہے بلکہ انشاء اللہ یہی صورت رہی ہوگی کیونکہ تمام مفسرین کا اسی طرف رجحان ہے۔ لیکن ابن اسحٰق رحمتہ اللہ علیہ نے ابن عباس اور علماء تورات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ابلیس آدم علیہ السلام اور انکی بیوی حوا علیہما السلام تک اس صورت سے پہنچا تھا جو اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام اور انکی نسل کو مبتلا کرنے کے لئے متعین کر دی ہے، کہ وہ لوگوں کے خواب، بیداری کا اور تمام ہی احوال میں آتا ہے، پھر انھیں گناہ کیطرف بلاتا ہے اور ان کے دل میں برائیوں کی تمنا پیدا کرتا ہے، لیکن انسان اسے نہیں دیکھ پاتا۔ اللہ تعالےٰ نے خود ہی فرمایا ہے کہ "فَوَسْوَسَ اِلَيْهِمَا الشَّيْطٰنُ فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ" (شیطان نے انھیں وسوسہ میں مبتلا کیا اور اس طرح جس میں وہ تھے اس سے انھیں نکالا) ایک موقعہ پر فرمایا۔ "يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ" (اے بنی آدم! تمہیں کسی آزمائش میں شیطان مبتلا نہ کردے، جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا، کہ اتارا ان سے ان کا لباس، تاکہ دکھائے انھیں ان کی شرمگاہ۔ وہ اور اسکی جماعت تمہیں اس طرح دیکھتی ہے کہ تم اسکو نہیں دیکھ سکتے، ہم نے شیاطین کو دوست بنا دیا ہے ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لائے) پھر انھوں نے وہ احادیث بیان کی ہیں جو نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے مروی ہیں کہ شیطان انسان کے جسم میں اس طرح دوڑتا رہتا ہے جیسے خون۔ ابن اسحٰق رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پھر شیطان کا معاملہ عام انسانوں کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا خود آدم علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس سے فرمایا "تو یہاں سے چلا جا۔ تجھے حق نہیں کہ یہاں پر تکبر کرے، یہاں سے نکل جا کہ تو ذلیلوں میں سے ہے"۔ پھر ابلیس آدم علیہ السلام اور انکی بیوی تک راہ پاگیا اور جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے بیان کیا ہے ان سے گفتگو بھی کی، اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ پھر شیطان نے انھیں وسوسہ میں ڈالا اور کہا اے آدم کیا میں تمہاری رہنمائی کروں ایک ایسے درخت کی جانب جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور ایک ایسی حکومت کی جانب جو کبھی پرانی نہ ہو" اس میں آدم علیہ السلام کو بہکانے کی وہی صورت بیان کی گئی جو عام انسانوں کو بہکانے میں ہوتی ہے، یعنی آدم و حوا علیہما السلام نے بھی ابلیس کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اللہ ہی کو زیادہ علم ہے کہ ان دونوں میں سے کون سی صورت پیش آئی تھی۔

آدم علیہ السلام زمین پر

"فاخرجہما مما کانا فیہ" یعنی شیطان نے آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو بہشت کے اس آرام و راحت سے نکالا جس میں وہ تھے ہم نے پہلے لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے کی نسبت شیطان کیطرف کی ہے، حالانکہ نکالنے والا خود وہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شیطان نکلنے کا سبب بنا تھا اور سبب کیطرف کام کی اضافت و نسبت عام طور سے کیجاتی ہے۔ "وقلنا اہبطوا بعضکم لبعض عدو" (اور ہم نے کہا، اب تم سب نیچے اتر جاؤ، ایک دوسرے کے دشمن ہو کر) جب کوئی شخص کسی خاص جگہ میں چلا جائے تو اس کے لئے بولتے ہیں "اہبط فلاں ارض کذا" اس جملہ سے ہمارے اس دعوے کی پوری تائید ہوگئی کہ جنت سے آدم و حوا علیہما السلام کو نکالنے والا حقیقت میں اللہ تعالےٰ ہی تھا۔ اس جملہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدم اور حوا علیہما السلام اور ان کا دشمن ابلیس، سب ایک ساتھ زمین پر اترے تھے۔ کیونکہ اس سے پہلے صرف آدم و حوا علیہما السلام کا ذکر تثنیہ (دو) کے صیغہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اور یہاں پر جمع (دو سے زیادہ) کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اترنے کا حکم آدم و حوا علیہما السلام کو بہر حال

(بقیہ صفحہ ۷۰ پر)

ہوا تھا، لیکن ان کے علاوہ اور کون اس حکم کا مخاطب تھا؟ اس میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن صالح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام کے ساتھ ابلیس اور سانپ کو بھی یہ حکم تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام، ابلیس اور سانپ کو بھی یہ حکم تھا۔ اس فیصلہ کے ساتھ کہ تمہاری نسلیں ایک دوسرے کی دشمن رہیں گی۔ ابو العالیہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی اسی طرح کے اقوال مروی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام اور آپ کی نسل سے ابلیس کی دشمنی یہ تھی کہ اس نے آپ سے حسد کیا، اور اللہ تعالٰی نے جب اسے آپ کو سجدہ کا حکم دیا تو تکبر وغرور کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، اور اسے مٹی سے۔ آدم علیہ السلام اور آپ کی نسل کے مسلمان افراد ابلیس کے اس لئے دشمن ہیں کہ اس نے اللہ کی نافرمانی اور کفر کیا ہے آدم علیہ السلام اور آپ کی نسل سے سانپ کی دشمنی کے سلسلہ میں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ جب سے ان سے ہماری جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، ہم نے پھر کبھی ان سے صلح نہیں کی، پس جو شخص ڈر کے انھیں چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے" میرا خیال ہے کہ ہماری سانپوں سے دشمنی اس دن سے شروع ہوئی تھی، جب اس نے ابلیس کو جنت میں داخل کیا تھا حالانکہ اللہ تعالٰی اسے جنت سے نکال چکا تھا، اور پھر وہاں پہنچکر اس نے آدم اور حوا علیہما السلام کو بہکایا تھا۔ ہم اس سلسلہ کی روایتیں اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سانپ مارنے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ پیدائش سے ہی انسان اور سانپ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، انسان سانپ کو دیکھکر گھبرا جاتا ہے، اور اگر ڈس لے تو تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے وہ جہاں بھی ملے اسے مار ڈالو۔

"ولکم فی الارض مستقر" (اور تمہارے لئے زمین ہی پر ٹھکانا ہے) ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ آیت ایسی ہی جیسے ایک موقعہ پر ارشاد ہوا ہے کہ "جعل لکم الارض فراشا" (تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا) ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد اس آیت کے مطابق ہے کہ "جعل لکم الارض قرارا" (تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا) بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ "تمہارے لئے زمین میں قبروں کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا" ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی اور ابن زید رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے۔ "مستقر" کلام عرب میں ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب جنت اور آسمان کے بجائے، ان کے لئے ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ زمین میں ہوگی" "ومتاع الی حین" کا بھی یہی مطلب ہے کہ جنت کے بجائے اب انھیں زمین میں نفع اٹھانا ہے۔ "متاع الی الحین" کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ" اور موت تک پہنچنا ہے" سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی نقل ہے کہ اس سے مراد زندگی ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے اس سے مراد قیامت تک کا فائدہ اٹھانا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر منقول ہے ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ "موت تک فائدہ اٹھانا ہے" کلام عرب میں "متاع" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے فائدہ اٹھایا جائے، یہ فائدہ معاشی ہو یا زینت سے متعلق ہو، لذت سے متعلق ہو یا کسی بھی طرح کا ہو۔ چونکہ اس کا

(حاشیہ صفحہ ۶۹) ؎ اردو میں اسم کیلئے واحد اور جمع صرف دو صیغے استعمال ہوتے ہیں، واحد ایک کیلئے اور جمع ایک سے زیادہ کے لئے، لیکن عربی میں تین صیغے استعمال ہوتے ہیں، واحد ایک کے لئے، تثنیہ دو کے لئے اور جمع دو سے زیادہ کے لئے۔ (مترجم)

اصل مفہوم یہی ہے اور اللہ تعالےٰ نے ہر جاندار مخلوق کی زندگی کو اسکی "متاع" قرار دیا ہے کہ وہ جب تک زندہ رہتا ہے اس سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے، اسی طرح زمین بھی اس کے لئے متاع ہے کہ جب تک زندہ ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے جو کچھ اللہ تعالےٰ نے اسمیں سے روزی اور پھل پیدا کئے ہیں ان سے غذا حاصل کرتا ہے اور جو لذت کی چیزیں اس میں اللہ تعالےٰ نے پیدا کی ہیں ان سے لذت حاصل کرتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد اس کے پہلو میں اسے جگہ ملتی ہے اور اب بھی اس کے جسم کے لئے یہی قرار و منزل ہے اور متاع کا لفظ ان تمام چیزوں کو شامل ہے تو اس آیت میں بھی "متاع الے حین" سے مراد عام ہونا چاہیئے یعنی جب تک بنی آدم اور بنی ابلیس کا وجود اس زمین پر باقی رہے۔ کیونکہ اس عام مفہوم میں تخصیص کے لئے کوئی دلیل نہ قرآن مجید میں ہے اور نہ عقل ہی اسے ضروری قرار دیتی ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جنت میں جو تمہارے ٹھہرنے کی جگہ تھی اور تم اس سے فائدہ اٹھاتے تھے اس کے بجائے اب تمہارے گھر اور تمہارے ٹھہرنے کی جگہ زمین ہوگی، میں نے جو چیزیں زمین میں پیدا کی ہیں، تمہاری معیشت اور زندگی کی دوسری سہولتیں جو میں نے تمہارے لئے وہاں مقدر کی ہیں وہ تمہیں حاصل ہوں گی، جب تک زندہ رہو گے زمین کے اوپر چلو پھرو گے اور وفات کے بعد بھی اسی زمین کے اندر دفن کئے جاؤ گے اور اس طرح زمین سے تم نفع حاصل کرو گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اسے بدل دے گا (اور قیامت آجائے گی)۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ ھُوَ التَّوَّابُ

بعد ازاں حاصل کر لئے آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالےٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بے شک

الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اھْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف

مِّنِّىْ ھُدًى فَمَنْ تَبِعَ ھُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ

سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے

يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ

لوگ غمگین ہوں گے جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ

اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

توبہ، غفور و رحیم کی بارگاہ میں

"فتلقی آدم من ربه کلمات" (پھر آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے) تلقی کے معنے ہیں اخذ (لینا، سیکھنا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "لقاء" کے (مصدر مزید، تفعل سے ہے، جیسے بولتے ہیں، "تلقی الرجل الرجل" یعنی ایک شخص دوسرے شخص کے سفر وغیرہ سے واپسی کے وقت اس کا استقبال کرتا ہے اسی طرح یہاں بھی فتلقی ہے۔ یعنی جب اللہ نے ان کلمات کی ان پر وحی کی تو انھوں نے انکا استقبال کیا اور انھیں

حاصل کرلیا۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کے لئے چند کلمات کی تلقین کی اور آدم علیہ السلام نے انھیں اللہ تعالیٰ سے سیکھ لیا، پھر انھیں الفاظ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول کرلی۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کے لئے یہ کلمات سیکھے تھے۔ "رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اور اگر تو نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔") اس سلسلہ میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کون سے چند کلمات اپنے رب سے سیکھے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! کیا مجھے تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں پیدا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیوں نہیں! آدم علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! کیا تو نے میرے اندر اپنی روح نہیں پھونکی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں! عرض کی اے میرے رب! کیا تو نے مجھے اپنی بہشت میں نہیں ٹھہرایا؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کی اے میرے رب! کیا تیری رحمت تیرے غضب سے بڑھکر نہیں ہے؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کی، تو پھر اگر میں توبہ کر لوں اور اپنی اصلاح کر لوں تو کیا تو مجھے اپنی بہشت میں دوبارہ بلالے گا؟ فرمایا، کیوں نہیں! یہی تفصیل ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فتلقی آدم من ربہ کلمات" کی۔ ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ تفسیر نقل ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ کی" آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ بھی کہا تھا کہ اے میرے رب! اگر میں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں دوبارہ جنت میں بلالوں گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ حسن رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ میں یہ الفاظ کہے تھے "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین"۔ (اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اور اگر تو نے ہماری مغفرت نہ کی اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔) ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! اگر میں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، پھر میں تمہیں جنت میں دوبارہ بلالوں گا، توبہ بھی انھیں کلمات میں سے ہے (جو توبہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے آپ نے سیکھے تھے) اور "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخسرین" بھی انھیں کلمات میں سے ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ جیسی ہے۔ لیکن عبید رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بیان کیا، آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے وہ پہلے ہی سے آپ نے میرے مقدر میں لکھدی تھی، یا بغیر تیری تقدیر کے میں نے خود یہ غلطی کی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہاری تقدیر میں اسے لکھدیا تھا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ جب آپ نے خود میری تقدیر میں اسے لکھدیا تھا۔ تو مجھے معاف بھی کردیجیے۔ بیان کیا کہ یہی وہ کلمات تھے جنھیں آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے سیکھا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کلمات آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے سیکھے تھے وہ یہ تھے۔ "اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ وَبِحَمْدِكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ تُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" (اے اللہ! کوئی معبود نہیں سوائے تیرے، تیری ذات پاک ہے اور تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے، میں تجھ سے مغفرت مانگتا ہوں، اور تیری طرف توبہ کرتا ہوں، میری توبہ قبول کر، بلاشبہ تو بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔)

ایک روایت میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ وہ کلمات یہ تھے "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔ آپ ہی سے دوسری روایت میں ہے کہ وہ کلمات یہ تھے۔ "اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" اے اللہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے اور تیرے ہی لئے تمام تعریف ہے، اے میرے رب میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، آپ میری مغفرت کر دیجئے کہ آپ سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے اور تیرے ہی لئے تمام تعریف سزاوار ہے، میرے رب! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، پس میری مغفرت کیجئے کہ آپ سب سے اچھے مغفرت کرنے والے ہیں، اے اللہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے اور تمام تعریف تیرے ہی لئے ہے میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، پس آپ میری توبہ قبول کیجئے کہ آپ بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہیں۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ وہ کلمات یہ تھے۔ "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين"۔

یہ تمام اقوال جنھیں ہم نے یہاں نقل کیا ہے، اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم سب کا ایک ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالٰے نے چند الفاظ توبہ کے لئے سکھلائے اور آپ نے انھیں سیکھ کر ان الفاظ کے ساتھ اللہ کے حضور میں توبہ کی، اس کے تقاضوں پر عمل کیا اور اپنی غلطی کا اعتراف اور اس پر اظہار ندامت کیا، اور اللہ تعالٰے نے بھی آپ کی توبہ قبول کی۔ آپ کی توبہ کے سلسلہ میں جو خاص الفاظ خود اللہ تعالٰے نے نقل کئے ہیں وہ ہیں "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين"۔ اس کے علاوہ جو دوسرے اقوال آپ کی توبہ کے سلسلہ میں ہم نے نقل کئے وہ بھی رد نہیں کئے جا سکتے، اگرچہ ان اقوال کی صحت کے لئے کوئی ایسی دلیل نہیں کہ انھیں تسلیم کرنا ضروری ہو۔ قرآن کی اس آیت میں اللہ تعالٰے نے اپنی اس کتاب کے تمام مخاطبوں کو بتایا ہے کہ گناہوں سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کس طرح کرنی چاہیئے اس کے علاوہ اس آیت میں ان لوگوں کے لئے بھی تنبیہ ہے جن کا ذکر "کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم" (تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، پھر اس نے تمہیں زندہ بنایا) میں اس پہلے ہو چکا ہے کہ وہ بھی اپنے کفر اور گمراہی سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کر کے نجات پا سکتے ہیں جس طرح ان کے جد امجد آدم علیہ السلام نے اپنی ایک غلطی سے توبہ کر کے اللہ کی رحمت و مغفرت حاصل کر لی تھی۔

اور توبہ قبول ہوئی

"فتاب علیہ" ای علیٰ آدم "علیہ" کی ضمیر "آدم" کیطرف لوٹتی ہے، یعنی اللہ نے آدم کو اپنی غلطی سے توبہ کی توفیق دی "توبہ" کا مفہوم ہے "اللہ کیطرف رجوع اور اسکی نافرمانی چھوڑ کر اسکی اطاعت و فرمانبرداری میں لگ جانا"۔ "انہ ھو التواب الرحیم" یعنی اللہ تعالٰے تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا، اپنے ان گنہگار بندوں کی جو گناہ چھوڑ کر اس کی طرف رجوع کریں اور جو معصیت و نافرمانی پہلے ان سے ہو چکی ہے اس پر نادم ہو کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگ جائیں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ بندوں کی طرف سے اپنے رب کی بارگاہ میں "توبہ" کا مفہوم یہ ہے کہ اسکی اطاعت کرے اور ان اعمال

میں لگ جائے جو اس کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہوں اور ان کاموں کو چھوڑ دے جو اسکی ناراضی اور غضب کا باعث بنتی ہیں اور جنھیں وہ اس سے پہلے کرتا تھا۔ اسی طرح اگر اللہ کیطرف توبہ کی نسبت کیجائے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندے کو توبہ کی توفیق دی، غضب کے بجائے اس سے خوش ہوا اور سزا کے بجائے اسے معاف کردیا۔ "الرحیم" کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے توبہ کے ساتھ اس پر رحمت بھی کی اور اسکی رحمت اپنے گنہگار بندے پر یہ ہے کہ اسکی لغزش و گناہ کے اثرات کو اس نے بالکل ختم کردیا اور اس کے جرم کی جو سزا ضروری تھی اسے معاف کردیا۔ "قلنا اھبطوا منہا جمیعا" کی تفسیر ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں، جو مطلب اس موقعہ پر اس آیت کا تھا وہی یہاں بھی ہے، اسلئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تمہاری دنیا کا نظام میرے قانون کے مطابق ہونا چاہیئے

"فاما یاتینکم منی ھدًی" (پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے) "ھدًی" کا مطلب یہاں ہدایت ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت میں "ھدًی" سے مراد انبیاء رسل اور بیان ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی بنیاد پر "اھبطوا" کا خطاب اگرچہ براہ راست آدم علیہ السلام اور آپکی بیوی سے ہے، لیکن اس سے مراد آپ کی نسل بھی ہوگی اس صورت میں یہ آیت ایسی ہی ہو جائے گی جیسے اللہ تعالےٰ کا ایک موقعہ پر ارشاد ہے کہ "فقال لھا وللارض ائتیا طوعًا او کرھًا قالتا اتینا طائعین" (اللہ تعالےٰ نے آسمان و زمین سے کہا کہ آجاؤ خوشی سے یا جبراً، تو انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آئے) یعنی ہم پر جو مخلوق رہتی ہے ہم ان سب کے ساتھ خوشی سے آئے۔ کلام عرب میں اس طرح کے استعمال بکثرت اور عام ہیں۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی بنیاد پر "اھبطوا" کے جس مفہوم کی ہم نے وضاحت کی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر اتارے جانے کے بعد اپنی پوری زندگی میں خود نبوت کے منصب پر فائز رہے، یعنی آپ اللہ تعالےٰ کی جانب سے اپنی اولاد کے لئے رسول تھے۔ اس لئے ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی بنیاد پر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ رسول بھی ہوں اور پھر آپ ہی کو اس آیت "فاما یاتینکم منی ھدًی" کا مخاطب بھی کہا جائے۔ لیکن میرے نزدیک آیت کی تفسیر کا صحیح اور حق طریقہ یہ ہے کہ جو مفہوم آیت سے واضح اور صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے اس کے مطابق تفسیر کیجائے، اس لئے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "پھر اگر میری طرف سے تمہیں، اے وہ لوگو جنھیں میں نے زمین پر اتارا ہے یعنی آدم علیہ السلام، آپ کی بیوی اور ابلیس، میرے حکم و طاعت کی کوئی تفصیل اور میرے راستے اور دین کی طرف رہنمائی پہنچے تو تم میں سے جو کوئی اسکی پیروی کریگا اس کے لئے کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ اسے رنج ہوگا اور اگر انھوں نے پہلے گناہ یا میرے حکم کے خلاف کوئی کام کیا ہے تو اللہ تعالےٰ نے ان کے متعلق بھی فرمادیا کہ اگر کوئی اسکی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرے تو وہ توبہ قبول کرتا ہے اور ان لوگوں پر رحم کرتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرتے ہیں" "انہ ھو التواب الرحیم" ظاہر ہے کہ یہ خطاب انھیں مخلوقات سے ہے جنھیں اللہ نے حکم دیا تھا کہ "اھبطوا منہا جمیعا" (تم سب یہاں سے اتر جاؤ) اور جنھیں یہ حکم ہوا تھا انکی نشاندہی ہم نے صحابہ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں پہلے ہی کردی ہے۔ اور اگرچہ اس آیت کا خطاب اس وقت تو خاص انھیں مخلوقات سے تھا جو آسمان سے زمین پر اتاری گئی تھیں، لیکن اللہ کی یہ سنت اسکی تمام مخلوقات کے لئے ہے اس سورت کی ابتدا میں "ان الذین کفروا سواء علیہم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون" (جن لوگوں نے کفر کیا، برابر ہے انکے لئے، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے)

اور آیت " لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، حالانکہ وہ ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہیں " میں جن طبقوں کا ذکر ہوا ہے وہ سب اس حکم کے ذیل میں آجاتے ہیں کہ اب بھی اگر وہ توبہ کریں، اللہ کیطرف رجوع کریں، اور اللہ تعالےٰ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو شریعت بھیجی ہے اسکی پیروی کریں تو یہ لوگ بھی اللہ کے یہاں آخرت میں ان لوگوں میں سے ہوں گے جنھیں کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ رنج و افسوس کریں گے۔ لیکن اگر انھوں نے توبہ و رجوع نہیں کی اور کفر و گمراہی میں ہلاک ہو گئے تو پھر انکا ٹھکانا ہمیشہ کے لئے جہنم ہے۔ " فمن تبع ہدای " یعنی جس نے میرے بیان اور ہدایت کی پیروی کی جو میں نے اپنے انبیاء کے ذریعہ واضح اور صاف کردی ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ " فمن تبع ہدای " یعنی " جس نے میرے بیان کی پیروی کی " فلا خوف علیہم " تو وہ قیامت کی ہولناک اور گھبرا دینے والی گھڑیوں میں اللہ کے عذاب سے مامون و محفوظ ہوں گے، کیونکہ دنیا میں انھوں نے اس کے احکام کی پیروی اور اطاعت کی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے ہیں۔ اس لئے انھیں اس کے عذاب کا کوئی ڈر نہ ہوگا " ولاہم یحزنون " اور اس دن ان چیزوں کا انھیں کوئی رنج و غم نہ ہوگا جو انھوں نے اپنے مرنے کے بعد دنیا میں چھوڑا تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ " والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا " (اور جو لوگ میری آیتوں کا انکار کریں گے اور میرے رسولوں کو جھٹلائیں گے " یہاں آیات اللہ سے مراد اسکی وحدانیت اور ربوبیت کے دلائل و شواہد ہیں جو نشانیاں اور جو ذہر انبیاء لیکر مبعوث ہوئے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ " کفر " کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اولئک اصحب النار ھم فیہا خلدون " یعنی وہ لوگ جو واقعی جہنمی ہیں ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اسکی کوئی انتہا اور حد نہیں یہ حکم ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو واقعی جہنمی نہیں (اور اپنے گناہوں کی وجہ سے ایک خاص مدت کے لئے جہنم میں لائے گئے ہیں) ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم میں ڈالے جانے والا وہ طبقہ جو واقعی جہنمی ہے وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ اسے زندگی کی مسرت حاصل ہوگی۔ البتہ جہنم میں ڈالے جانے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں انکی غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے آگ میں ڈالا جائے گا۔ آگ سے ان پر موت طاری ہو جائے گی اور جب وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے تو ان کے لئے شفاعت کی اجازت ہوگی۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ

اے بنی اسرائیل (یعنی اولاد حضرت یعقوب علیہ السلام کی) یاد کرو تم میرے ان احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ

اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہدوں کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو

وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَلَا تَکُوۡنُوۡۤا

اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو

اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّ

جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے) اور مت بنو تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے

(اور مت لو میری آیتوں کے معاوضہ میں تھوڑی قیمت) اور

إِيَّايَ فَاتَّقُونِ ○ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ
خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور

تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ
پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے ہو اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر

وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ○ أَتَأْمُرُونَ
اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور

النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ط
لوگوں کو نیک کام کرنے کو (نیک کام سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط
کتاب کی تو کیا پھر تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور (اگر تمکو حب مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو) مدد لو صبر اور نماز سے

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ○ الَّذِينَ يَظُنُّونَ
اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے انپر کچھ دشوار نہیں وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں

أَنَّهُمْ مُلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ○ ع ۵
۵ اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیشک اپنے رب کیطرف واپس جانیوالے ہیں۔

بنی اسرائیل

"یٰبَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ" (اے بنی اسرائیل!) بنی اسرائیل، حضرت یعقوب بن حضرت اسحٰق بن حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کو کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسرائیل کہتے تھے (عبرانی میں) اس کا مفہوم ہے" اللہ کا بندہ اور اسکی مخلوق میں اس کا منتخب"۔ "ایل" کے معنی اللہ اور "اسرئی" بمعنی بندہ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی مفہوم روایت ہے۔ عبداللہ بن حارث رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ عبرانی زبان میں "ایل" اللہ کو کہتے تھے۔ "یا بنی اسرائیل" سے اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کے احبار اور علمار کو خطاب کیا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانہ میں مدینہ میں رہتے تھے۔ انکی نسبت براہ راست ان کے جد امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف ایسی ہی ہے جیسے عام انسانوں کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف قرآن مجید میں مختلف مواقع پر ہوئی ہے "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ" (اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) پہن لیا کرو) ان آیتوں میں اور اس کے بعد کی ان آیتوں میں جن میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے انعامات کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح اس سے پہلے کی آیتوں میں خاص خطاب یہودیوں کو اس لئے ہوا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان تمام واقعات اور پچھلے انبیار کے متعلق اطلاعات کو وضاحت کے ساتھ بیان کر کے یہودیوں کے سامنے یہ حقیقت صاف کر دینا چاہتا ہے کہ یہ وہ واقعات ہیں جن کا علم اس سے

پہلے صرف تمہیں کو تھا، دوسری قومیں اور تمہارے پڑوسی عرب قبائل اس سے بہت کم واقف تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم انھیں میں پیدا ہوئے، انھیں میں پرورش پائی اور خاص طور سے امی ہونے کی وجہ سے انھیں تمہاری آسمانی کتاب کا علم صفر کے درجہ میں تھا۔ لیکن انھیں کی زبانی اللہ تعالےٰ نے وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جو صرف تمہیں (علماء یہود) کو معلوم تھا، تمہارے سوا کوئی انھیں نہیں جانتا تھا۔ کیا یہ اسکی دلیل نہیں ہے کہ جس کلام میں، ان حقائق کا انکشاف ہوا ہے وہ صرف وحی کے ذریعہ آپ تک پہنچا ہے اور یہ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ واقعی آپ اللہ کے رسول اور اس کے پیغمبر ہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے ان آیتوں میں خاص طور سے یہودیوں کو خطاب کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "یا بنی اسرائیل" میں خطاب علماء یہود سے ہے۔

احسان فراموشی

"اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم" امیرادہ انعام یاد کرو (جریر نے تمیر کیا ہے) بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات یہ تھے کہ اس نے ان میں سے پیغمبر اور رسول بنائے، ان پر کتابیں نازل کیں، فرعون اور اس کی قوم نے جس بلاء و مصیبت میں انھیں ڈال رکھا تھا انھیں اس سے نجات دلائی، انھیں زمین پر ٹھہرنے کی جگہ دی، پتھر سے ان کے لئے چشمے جاری کئے اور ان کے کھانے کے لئے من و سلویٰ اتارا۔ لیکن انھوں نے ان سب انعامات کی ناشکری کی اللہ تعالےٰ نے بھی انھیں اسکی سزا دی۔ اب اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کی اولاد کو تنبیہ کرتا ہے کہ تمہارے آباء و اجداد کے ساتھ ہم نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اسے نہ بھولو اور جس طرح انھوں نے ہمارے انعامات کی ناشکری کی تھی، تم بھی انھیں کے نقش قدم پر نہ چلو، ورنہ تمہیں بھی وہی سزا دیجائے گی جسے "، تمہارے وہ اسلاف بھگت چکے ہیں۔ جنھوں نے ناشکری اور کفران نعمت کیا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد اور ابو العالیہ رحمہما اللہ سے اسی طرح روایت ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کے انعامات بہت عام ہیں اور ایمان و اسلام کی دولت سے بڑھکر اور کوئی انعام نہیں، باقی تمام انعامات اسی کے تابع ہیں۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ "یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ" الآیۃ (یہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ مطیع ہو گئے ہیں، آپ کہدیجئے کہ مجھ پر اپنے مطیع ہوجانے کا احسان نہ رکھو") ان آیتوں میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی اپنے انعامات کی یاددہانی ایسی ہی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی زبانی انکی قوم کو ان پر اللہ تعالےٰ کے انعامات یاد دلائے گئے تھے "اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ" (وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے اور تمہیں خود مختار کیا اور تمہیں وہ دیا جو دنیا جہان میں کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا تھا)

پہلے تم اپنا فرض ادا کرو

"واوفوا بعھدی اوف بعھدکم" (اور مجھ سے وعدہ پورا کرو تو میں تم سے وعدہ پورا کروں) اس سے پہلے "عہد" کا مفہوم اس کی تعیین میں مختلف اقوال اور اپنی رائے ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اللہ تعالےٰ کا وہ فریضہ اور اسکی وہ وصیت ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو تورات میں کی تھی کہ سب کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی وضاحت کر دیں، یہ کہ ان کے یہاں تورات میں یہ لکھا ہوا ہے کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ اس پوری شریعت پر ایمان لائیں جو آنحضور پر نازل ہوئی ہے" تو میں بھی تم سے وعدہ پورا کرونگا" اللہ تعالیٰ کا ان سے وعدہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اپنے ان فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کر دیا تو وہ انھیں جنت میں جگہ دیگا۔

اسی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ "لَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا" الآیہ (اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا اور ہم نے ان پر بارہ سردار مقرر کئے تھے)۔

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے "فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ" الآیہ (سو اسے ان لوگوں کے لئے تو ضرور ہی لازم کردوں گا جو خوف خدا رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں جو لوگ اس امی رسول اور نبی کی پیروی کرتے ہیں)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے، ابو العالیہ، سدی، ابن جریج اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی اسی کے مطابق تفسیر روایت ہوئی ہے۔ "وایای (اور تم صرف مجھی سے ڈرتے رہو) اور اے بنی اسرائیل جو میرے عہد کو ضائع کر رہے ہو، اور اپنے میثاق کے خلاف میرے رسول کو جھٹلاتے ہو، ان پر ایمان لاؤ اور انھیں کی اتباع کرو، کہیں تمہاری مخالفت اور سرکشی کے نتیجہ میں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو تمہارے اسلاف پر آچکا ہے جنھوں نے میرے حکم کی مخالفت اور سرکشی کی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر روایت ہے۔ ابو العالیہ اور سدی رحمہما اللہ نے بھی "وایای فارہبون" کا ترجمہ کیا ہے کہ "اور تم صرف مجھی سے ڈرو" "وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم" (اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے اب نازل کی ہے، تصدیق کرتی ہوئی اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے) "آمنوا" بمعنی صدقوا (تصدیق کرو) اس لفظ کی وضاحت ہم نے پہلے کردی ہے، "بما انزلت" (جو میں نے نازل کی ہے) کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کتاب جو میں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے یعنی قرآن "مصدقا لما معکم" تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو تمہارے پاس ہے) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید تورات کی تصدیق کرتی ہے جو یہود بنی اسرائیل کے پاس موجود ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے انھیں بھی قرآن کی تصدیق کا حکم دیا اور یہ بھی بتادیا کہ قرآن کی تصدیق خود تورات کی تصدیق ہے، کیونکہ قرآن مجید میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور آپ کی اتباع کا جو حکم ہے وہی حکم خود تورات و انجیل میں بھی موجود ہے، اسلئے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی کتاب قرآن مجید کی تصدیق، تورات کی تصدیق کے مرادف ہے اور اسکی تکذیب تورات کی تکذیب کے مرادف ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے یہود! جو کچھ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ کہ یہ اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے" اور ان کے پاس تورات و انجیل موجود تھی۔ یہی تفسیر مجاہد اور ابو العالیہ رحمہما اللہ سے روایت ہے۔

پہلے منکر

"ولا تکونوا اول کافر بہ" میں "کافر" واحد ہے (جو کسی ایک فرد کے لئے آتا ہے) لیکن آیت میں خطاب جماعت یہود سے ہے، اسلئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک جماعت کے لئے واحد کے صیغہ کا استعمال کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "افعل" کے وزن کا (جو یہاں "اول" ہے) مضاف الیہ اگر اسم مشتق ہو تو اسے واحد لاکر بھی اس سے جمع مراد لی جاسکتی ہے، اس سے اشارہ اسی مراد کی طرف ہوتا ہے جو کلام میں محذوف ہوتا ہے، یعنی جمع و تانیث کے مفہوم کو ادا کرنے کے سلسلے میں جو اس لفظ کے، اس کے واحد ہونے کے باوجود، قائم مقام ہو۔ مثلاً اگر کہیں کہ "ولا تکونوا اول من یکفر بہ" (اور ان لوگوں میں سے نہ بنو جو اولین کفر کرنے والے ہیں) تو یہاں لفظ "من" جمع کے معنی میں ہوگا اور تثنیہ، جمع اور تانیث

سب صورتوں میں یہی لفظ کسی بھی تصرف کے بغیر استعمال ہوگا۔ اسلئے جب فعل یفعل کے وزن سے نکلا ہوا اسم مشتق واحد ہونے ہوئے اس کے قائم مقام ٹھیرایا گیا تو جمع وتانیث کے سلسلہ میں اسی مفہوم کی ادائیگی کرے گا۔ جب بولتے ہیں "اَلْجَیْشُ مُنْهَزِمٌ" (لشکر شکست کھا گیا) "اَلْجَمْعُ مُقْبِلٌ" (جماعت آرہی ہے) یہاں منہزم اور مقبل کو واحد استعمال کیا گیا، کیونکہ لفظ جیش (لشکر) اور "جمع" (جماعت) بھی واحد ہے۔ کلام عرب میں اس طرح استعمال ہوتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب کے عالمو! اس قرآن کی تصدیق کرو جو میں نے اپنے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے جو خود تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے یعنی تمہارے پاس تورات و انجیل کتاب آسمانی ہے اس میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول اور میرے نبی ہوں گے جو حق کے ساتھ مبعوث ہوں گے۔ اور جب کہ تمہارے پاس اس سلسلے میں وہ علم ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں تو اس قرآن کے اولین جھٹلانے والوں میں سے نہ بنو۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ" اول کافر بہ" میں بہ کی ضمیر قرآن کیطرف لوٹتی ہے (یعنی قرآن کے اولین جھٹلانے والوں میں سے نہ بنو) لیکن ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "بہ" کی ضمیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف لوٹتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اولین جھٹلانے والوں میں سے نہ بنو۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "بہ" کی ضمیر کا مرجع خود انکی کتاب تورات ہے یعنی تورات کے اولین جھٹلانے والوں میں سے نہ بنو اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم کی تکذیب خود انکی اپنی کتاب کی تکذیب ہے، کیونکہ انکی کتاب میں آنحضورؐ کی اتباع کا حکم ہے۔ لیکن آخری دونوں تفسیریں آیت کی تفسیر سے بہت دور ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں جن لوگوں کو خطاب کیا ہے انھیں سب سے پہلے اس چیز پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس نے نازل کی۔ ارشاد ہے" وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم" (اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے اب نازل کی ہے، تصدیق کرتی ہوئی اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے) ظاہر ہے کہ جو چیز اللہ تعالےٰ نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نازل کی تھی وہ قرآن ہے۔ خود حضور اکرم اس کے مصداق نہیں ہوسکتے، کیونکہ آپ کو تو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، آپ کے لئے نازل کرنے کا اطلاق صحیح نہیں ہوسکتا، جو چیز نازل ہوئی وہ کتاب تھی۔ پھر انھیں اس سے منع کیا کہ جس چیز پر ابھی انھیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اس کے اولین کفر کرنے والے بنیں۔ اس کا مفہوم بھی ظاہر ہے۔ یہاں حضور اکرم کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے کہ" اول کافر بہ" کی ضمیر آپ کیطرف لوٹائی جاسکے۔ اگرچہ کنایۃً آپ کا ذکر آگیا ہے اور اس حیثیت سے ضمیر لوٹائی بھی جاسکتی ہے لیکن یہ بہت دور کی کوڑی ہے اسی طرح " لما معکم" (وہ کتاب جو تمہارے پاس موجود ہے) کیطرف بھی ضمیر نہیں لوٹائی جاسکتی، اگرچہ یہ بھی خارج از امکان نہیں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ضمیر کسی کدوکاوش کے بغیر جب قرآن کیطرف لوٹتی ہے تو اس طرح کی تاویل سے کیا فائدہ؟۔ اتنی بات تو بالکل صاف ہے کہ آیت کے شروع میں جس پر ایمان کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے، اس لئے اس کے فوراً بعد جس کے کفر و انکار سے روکا گیا، قدرتی طور پر وہ بھی قرآن مجید ہی ہوگا۔ ایک ہی کلام اور ایک ہی آیت میں اس طرح دو چیزیں مراد لینا غیر واضح اور مبہم طریقہ ہے۔

لالچ اور ضمیر فروشی

" ولا تشتروا بآیتی ثمنا قلیلا" (اور میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت مت کر ڈالو) ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں روایت ہے کہ " میری آیتوں کی اجرت مت لو" آپ نے بیان کیا کہ انکی کتاب میں لکھا ہوا

تھا کہ اے آدم کے بیٹو! لوگوں کو علم اجرت کے لئے بغیر سکھاؤ، جیسے میں نے تمہیں بغیر کسی اجرت کے علم سکھایا تھا۔ لیکن سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر روایت ہے کہ "معمولی سی قیمت کے لالچ میں اللہ کا نام نہ چھپاؤ" اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمہیں میں نے اپنی کتاب اور آیات کا علم دیا ہے اسے معمولی سے دنیا کے نفع کے لئے نہ بیچو۔ دنیاوی نفع کے لئے آیتوں کی فروخت یہ تھی کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کے حق ہونے سے متعلق جو کچھ انکی کتاب میں تھا اور کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ معمولی پونجی انھیں ان کے بدلے میں اس مال و دولت کی صورت میں ملتی تھی، جو ان کے ہم مذہب لوگ کتاب الٰہی کی تعلیم اور اس کے مسائل بیان کرنے کے بدلے میں انھیں دیا کرتے تھے وہ حق کے مقابلہ میں اس دنیاوی دولت سے خوش تھے۔" وایای فاتقون" (اور صرف مجھی سے ڈرو) یعنی میری آیتوں کو معمولی پونجی کے بدلے میں نہ بیچو، تاکہ تم اس طرح دنیا کی باقی نہ رہنے والی عزت حاصل کرلو، اور جو کچھ میں نے رسول پر نازل کیا ہے اس کا کفر و انکار کرنے میں مجھ سے ڈرو کہ کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ نازل ہوجائے جو تمہارے اسلاف و اجداد پر اس کفر و انکار کے بدلے میں نازل ہوا تھا۔" ولا تلبسوا الحق بالباطل" "لا تلبسوا" یعنی خلط ملط نہ کرو (حق کو باطل کے ساتھ) "لبس" کے معنی خلط ملط کرنا ہے" جب معاملہ خلط ملط ہوجائے تو بولتے ہیں" لبست علیہم الامر" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت "لَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ" کی تفسیر یہ منقول ہے کہ ہم خلط ملط کر دیتے ہیں ان پر وہ جسے وہ خود خلط ملط کرلیتے ہیں" لیکن "لبس" جس سے لبستہ، البسہ، لبساً اور ملبساً استعمال ہوتا ہے تو یہ کپڑا پہننے کے معنی میں آتا ہے۔ اب سوال یہ رہجاتا ہے کہ آیت کے مخاطب کفار تھے پھر ان کے پاس حق کون سا تھا جسے باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان یہودیوں میں بہت سے منافق بھی تھے، یہ لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر مسلمانوں کے سامنے اپنے ایمان و یقین کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لیکن کفر و انکار ان کے دلوں میں چھپا ہوا تھا، ان کا ایک بڑا پرفریب تخیل یہ تھا کہ حضور اکرم نبی واقعی ہیں اور اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ لیکن ہماری طرف نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے آپ نبی ہیں۔ اس طرح حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے تھے کہ زبان سے آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار کرتے تھے اور ظاہر یہ کرتے تھے کہ آنحضورؐ اور آپ کی شریعت حق ہے، لیکن باطل ان کے دل میں چھپا ہوا تھا اور اپنے دل کے اس چور کا...... حق کے ساتھ خلط ملط کیا کرتے تھے۔ ان ہی ایک طبقہ حق کو باطل کے ساتھ یوں خلط ملط کیا کرتا تھا کہ آنحضرتؐ کی بعثت دوسرے لوگوں کی طرف ہوئی ہے، یہودیوں کے آپؐ نبی نہیں ہیں۔ یعنی آپ کے نبی برحق ہونے کا اقرار اور پھر اس حق کے ساتھ ایک باطل کی آمیزش، کہ آپ کی بعثت انکی طرف نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ آنحضورؐ تمام انسانوں کے نبی تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ "لا تلبسوا الحق بالباطل" یعنی سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط نہ کرو ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں عام بندوں کے ساتھ خیر خواہانہ طرز عمل اختیار کرو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ خلط ملط نہ کرو" ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حق سے مراد وہ تورات ہے جو موسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور باطل وہ کمی اور زیادتی ہے جو انھوں نے اس میں اپنی طرف سے کردی تھی" وتکتموا الحق وانتم تعلمون" "تکتموا الحق" کی تفسیر میں دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالٰے نے انھیں جس طرح اس سے پہلی آیت میں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے سے منع کیا تھا تو یہاں انھیں حق کو

چھپانے سے روکا ہے، اس تفسیر کی بنیاد پر پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ" اس طرح تکتموا کا عطف تلبسوا پر ہوگا اور جس "لا" کی وجہ سے تلبسوا پر جزم ہے اسی کی وجہ سے اس پر بھی ہوگی دوسری تفسیر یہ ہے کہ آیت میں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے کی تو نہی اور ممانعت ہو، لیکن بعد میں ان کے حق کو چھپانے کی صرف اطلاع ہو کہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ حق کو چھپاتے ہیں ایسی صورت میں "تکتموا" پر صرف کیو جہ سے نصب ہوگا، یعنی "لاتلبسوا الحق بالباطل" میں جس طرح نہی کا مفہوم بیان کیا گیا ہے اس جملے میں اس طرح نہیں ہے، بلکہ اس کے بجائے خبر دی گئی ہے، علماء نحو ایسی صورت کو "صرف" کہتے ہیں اس آیت کی تفسیر میں پہلی صورت جو ہم نے لکھی ہے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے، دوسری تفسیر ابو العالیہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے منقول ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت میں "حق" سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس روایت کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے اہل کتاب علماء! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کے معاملے میں خلط ملط نہ کرو، اور لوگوں کو یہ باور نہ کراؤ کہ آنحضورؐ صرف چند قوموں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، تمام اقوام کے آپ نبی نہیں ہیں، اس طرح اس کے معاملہ میں نفاق سے کام نہ لو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ آنحضورؐ تمام امتوں اور دنیا کی تمام قوموں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اس طرح تم سچائی کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنا چاہتے ہو، اور اس حق کو چھپانا چاہتے ہو، جو تمھارے پاس تمھاری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضور اکرمؐ تمام انسانوں کے لئے میری طرف سے رسول ہیں، تمھیں معلوم ہے کہ آپ میرے رسول ہیں اور جس کی آپ دعوت دیتے ہیں وہ میری طرف سے ہے، تمھیں وہ عہد و میثاق بھی اچھی طرح معلوم ہے جو میں نے تم سے تمھاری کتاب میں لیا تھا کہ تم آنحضورؐ پر اور آپ کی شریعت پر (آنحضورؐ جب مبعوث ہوں گے تو) ایمان لاؤ گے۔

کچھ تم بھی کر کے دکھاؤ

"وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ جھکتے رہو)۔ بیان کرتے ہیں کہ احبار یہود (یہودیوں کے علماء) اور منافقین دوسروں سے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کے لئے کہتے تھے، لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ انھیں سچے اور مخلص مسلمانوں کے ساتھ نماز قائم کرنے اور ان کی طرح اپنے مال کی زکوٰۃ دینے کا حکم دیتا ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ "دو فریضے تم پر اللہ کی طرف سے واجب ہیں انھیں ادا کرو۔ ہم "اقامۃ الصلوٰۃ" (نماز قائم کرنے) کو اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں اس لئے دوبارہ اسے دہرانا کچھ مناسب نہیں ہے، "ایتاء الزکوٰۃ" (زکوٰۃ دینا) سے مراد اس صدقہ کی ادائیگی ہے جو (کسی کے مال میں) فرض ہوتا ہے۔ "صدقہ" کا اصل معنیٰ مال میں بڑھوتری ابتیاء اور زیادتی ہے۔

جب کھیتی کی پیداوار اللہ تعالیٰ زیادہ کردے تو بولتے ہیں "زکا الزرع" اسی طرح جب خرچ بڑھ جائے تو بولتے ہیں "زکت النفقۃ"۔ کسی تنہا چیز کا جوڑا مل جائے تو بولتے ہیں "زکا الفرد"۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسا مال ہے جو دوسرے مال سے نکالا جاتا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ اس میں اور اس مال میں جو مالک کے پاس باقی رہ گیا ہے تمیز پیدا کردے۔

اس نام کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زکوٰۃ نکالنے والے کے پاس جو مال باقی رہ گیا ہے یہ زکوٰۃ اسے پاک کرتی ہے، اور نہ نکالنے کی صورت میں جو ظلمت اور تاریکی اس کے اندر پیدا ہوتی ہے یہ اس سے نکالتی ہے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک اطلاع دیتے ہوئے فرمایا ہے "اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً" (کیا تو نے ایک نفس زکیہ کو قتل کر دیا) یہاں زکیہ سے مراد ایسا نفس (جان) ہے جو گناہوں سے پاک اور بری ہو۔ کسی شخص کے متعلق "عَلَىٰ لِيْ زَكِيٌّ" بھی اسی مفہوم کے اعتبار سے

کہا جاتا ہے۔ "رکوع" سے مراد اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی طاعت میں جھکنا ہے۔ بولتے ہیں "رکع فلان لکذا" فلاں شخص فلاں وجہ سے جھک گیا۔

جن احبار بنی اسرائیل اور منافقین کا ذکر پہلے سے چلا آرہا ہے، اس آیت میں بھی خاص طور سے انھیں کو حکم ہے کہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی طاعت و عبادت کے لیے جھکیں۔ دوسری طرف ان حقائق کو چھپانے سے رو کا جو وہ حضور اکرم کی نبوت کے متعلق جانتے ہیں۔

" اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم " (کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو؟) اس پر تو تمام علما متفق ہیں کہ اللہ کی ہر طاعت و عبادت کو "برٌّ" (نیکی) کہا جاسکتا ہے، لیکن مفسرین کے اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں کہ اس آیت میں "بر" سے کیا مراد ہے جس کا وہ لوگ دوسروں حکم دیتے تھے، لیکن خود نہیں کرتے تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبوت اور عہد سے متعلق تمہارے پاس تمہاری کتاب میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کے کفر سے تم دوسروں کو تو منع کرتے ہو لیکن اپنے کو بھول جاتے ہو، یعنی تم خود میرے اس عہد کا جو تمہاری کتاب میں موجود ہے اور جو تم نے مجھ سے کیا تھا کہ میرے رسول کی تصدیق کروگے، کفر کرتے ہو اور میرے عہد و میثاق کو توڑتے ہو، دوسری آیت میں مزید وضاحت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے "تم لوگوں کو دین محمد میں داخل ہونے اور اس کے علاوہ اقامت صلوٰۃ وغیرہ کا تو حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو"۔ دوسرا قول سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل لوگوں کو اللہ کی اطاعت اور تقویٰ کا حکم دیا کرتے تھے، لیکن خود نافرمانی اور گناہ میں مبتلا تھے (اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں شرم دلائی)۔ قتادہ اور ابن جریج رحمہما اللہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص ان سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھنے آتا، جس میں رشوت وغیرہ ملنے کا کوئی سوال نہ ہوتا تو وہ حق بات بتا دیتے"۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نیکی کا دوسروں کو حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو۔

ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ابو درداء رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا "کسی بھی شخص کو پوری طرح دین کی سمجھ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اگر کسی دوسرے پر اللہ کے بارے میں غصہ ہوتا ہے تو اسی وقت اپنی ذات کا بھی محاسبہ اس سے زیادہ شدت کے ساتھ نہ کرے۔

"بر" (نیکی) کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں جتنے بھی اقوال ہم نے اس موقع پر نقل کیے ہیں وہ اگرچہ بظاہر مختلف ہیں، لیکن سب کا منشا ایک ہی ہے، کیونکہ تمام اقوال کا منشا یہی ہے کہ علما بنی اسرائیل دوسروں کو ان باتوں کا حکم دیتے تھے جس پر عمل میں اللہ کی رضا اور خوشنودی تھی، لیکن خود عملاً ان احکام کے خلاف کرتے تھے، اس لئے آیت کی زیادہ مناسب تفسیر اس کی ظاہری ترتیب کے اعتبار سے یہی ہوگی کہ "کیا تم دوسروں کو اللہ کی طاعت کا حکم دیتے ہو لیکن اپنے کو ہر گناہ کیلئے آزاد چھوڑ دیتے ہو، اپنے کو بھی وہی حکم کیوں نہیں دیتے جو دوسروں کو دیتے ہو

"تَنسَوْنَ اَنفُسَكُمْ" میں "نسیان" کا مفہوم وہی ہے جو اس آیت میں ہے۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (انھوں نے اللہ کو بھلایا تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا، یعنی انھوں نے اللہ کی طاعت چھوڑ دی تو اللہ نے اس کے ثواب سے انھیں محروم کردیا۔

"وَاَنتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "اَنتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی درآنحالیکہ تم کتاب پڑھتے رہتے ہو کتاب سے مراد توراۃ ہے"۔ "افلا تعقلون" "یعنی تم جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود نہیں کرتے، بلکہ اپنے رب کی معصیت کرتے ہو تو کیا تم اس کی برائی اور قباحت کو نہیں سمجھتے" کیا تم جو دوسروں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ پر ایمان لانے کا حکم دیتے ہو تو یہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح ان کے لیے ضروری ہے، تمہارے لیے بھی ضروری ہے۔ ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس بُری عادت سے آیت میں منع کیا ہے۔

صبر اور نماز

"وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" (اور صبر اور نماز سے مدد چاہو) "اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ" کا مطلب یہ ہے کہ میرے اس عہد کو پورا کرنے میں مدد چاہو جو تمھارا مجھ سے تمھاری کتاب میں موجود ہے کہ "تم میری طاعت کروگے، میرے حکم کی پیروی کروگے، مال و دولت اور دنیا کی محبت میں مبتلا نہ ہوگے، اور میرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ گے،" صبر اور نماز کے ساتھ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں "صبر" سے مراد روزہ ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ روزے میں صبر کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر اس چیز پر جو اللہ کی طاعت و عبادت کی بجا آوری اور اس کی معصیت کو چھوڑنے میں انسان کے نفس پر شاق گذرتی ہے صبر کا حکم دیا ہے "صبر" کا اصل مفہوم "نفس کو اس کی محبوب چیزوں سے روکنا اور اس کی خواہشات سے باز رکھنا ہے" مصیبت پر صبر کرنے والے کو بھی اسی لئے "صابر" کہتے ہیں کہ اس موقع پر آہ و واویلا سے جو نفس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے، وہ باز رہا۔ رمضان کے مہینے کو "شہر الصبر" (صبر کا مہینہ) بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ دن میں روزہ دار کھانے پینے کے سلسلے میں نفس کی تمام خواہشات کو روکے رکھتا ہے، بولتے ہیں "قتل فلان فلانًا صبرًا" یعنی جب کوئی شخص کسی کو قید کر رکھے، پھر قتل کرے، ایسے مقتول کو "مصبور" کہتے ہیں۔

"صلوٰۃ" کا مفہوم ہم نے اس سے پہلے بیان کردیا ہے، وفاء عہد اور طاعت و عبادت کے سلسلے میں صبر سے مدد چاہنے کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن نماز سے مدد چاہنے کا کیا مفہوم ہوگا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نماز میں کتاب اللہ کی تلاوت ہوتی ہے، اور اس میں دنیا کی بے حقیقتی اور اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں اور وہاں کے دائمی آرام کا ذکر ہے، اور اسی حیثیت سے نماز بھی اللہ کی طاعت کرنے والوں کو اس کی طاعت و فرمانبرداری میں انہماک اور کوشش کا جذبہ اور داعیہ پیدا کرسکتی ہے۔ چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کوئی کٹھن معاملہ پیش آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نماز کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے پیٹ کو دبائے ہوئے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے پیٹ میں درد ہے؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ جی ہاں۔ آنحضورؐ نے فرمایا "پھر کھڑے ہوجاؤ اور نماز پڑھو، کیونکہ نماز میں شفا ہے"۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے احبار بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اللہ کے عہد کو پورا کرنے میں اگر ان پر کوئی مشکل اور کٹھن وقت آئے تو صبر اور نماز سے مدد چاہیں۔ ایک موقعہ پر حضور اکرمؐ کو بھی اس کا حکم ہوا ہے ارشاد ہے،

"سو آپ (اے محمد) صبر کیجیے ان کی باتوں پر، اور اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہیے حمد کے ساتھ آفتاب کے طلوع سے قبل اور اس کے غروب سے قبل، اور اوقات شب میں بھی تسبیح کیجیے اور دن کے بھی اول و آخر میں تاکہ آپ خوش رہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود آنحضورؐ کو کٹھن گھڑیوں میں صبر اور نماز کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی ہے۔

عیینہ بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے انھیں ان کے بھائی "قثم" کی موت کی اطلاع دی، وہ اس وقت سفر میں تھے، پہلے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، پھر راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہوگئے، اپنی سواری روکی اور دو رکعت نماز پڑھی، دونوں رکعتوں میں بیٹھنے کی حالت کو بہت طویل کیا، پھر کھڑے ہوئے اور اپنی سواری کی طرف یہی آیت پڑھتے ہوئے بڑھے واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ وانھا لکبیرۃ الا علی الخشعین" (اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بے شک وہ گراں ہے لیکن خشوع رکھنے والوں پر نہیں)

ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ اس طرح آیت کی تفسیر کرتے تھے کہ "اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے میں صبر اور نماز سے مدد چاہو، اور یقین رکھو کہ یہ دونوں بھی اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت ہی ہیں"۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "صبر اور نماز اللہ کی رحمت کو (بندے تک پہنچانے میں) مدد کرتی ہیں"۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "اس آیت کے نازل ہونے پر مشرکین نے کہا — اے محمدؐ! آپ بہت دشوار کام کے لئے کہتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں میں نماز کی طرف تمھیں بلاتا ہوں اور معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" "وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ" (اور بلاشبہ وہ گراں ہے، لیکن خشوع رکھنے والوں پر نہیں) "اِنَّهَا" میں "هَا" کی ضمیر "صلوٰۃ" (نماز) کی طرف لوٹتی ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ضمیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اجابت (قبول کرنے) کی طرف لوٹتی ہے، اس کا لفظوں میں ذکر نہیں ہے اس لئے اس سے کنایہ کے طور پر مراد لیا جائے گا، لیکن کلام سے جو چیز ظاہر اور واضح ہے اسے چھوڑ کر ایک غیر واضح اور مبہم طریقہ کو اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ "لَكَبِيْرَةٌ" کا مفہوم ہے "شدید"، بھاری۔

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ" یعنی (وہ گراں ہے) لیکن اللہ کے اطاعت گزار بندوں پر نہیں، جو اس کی سطوت سے خوف کھاتے رہتے ہیں، اس کے وعدے اور وعید کی تصدیق کرتے ہیں" "الخاشعین" کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے اس کی تصدیق کرنے والے"۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس لفظ کا مفہوم "ڈرنے والے" منقول ہوا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد واقعی اور مخلص مؤمن ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ خشوع کے معنیٰ خوف اور اللہ سے ڈرنا ہے۔ آپ نے اس آیت کی تلاوت کی خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ" (لائے جائیں گے) ذلت سے جھکے ہوئے)۔ فرمایا کہ اس خوف نے انھیں جھکا دیا ہوگا جو ان پر طاری ہوگا اور اس سے وہ ڈرے سہمے ہوئے ہوں گے "خشوع" کا اصل معنیٰ تواضع، انکسار اور خاکساری ہے، ایک شعر ہے ؎

لَمَّا اَتٰى خَبَرُ الزُّبَيْرِ تَوَاضَعَتْ سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ وَالْجِبَالُ الْخُشَّعُ

(جب زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو مدینہ کی شہر پناہ زمین سے آلگی، پہاڑ جھک گئے)

مطلب یہ ہے کہ آپ کی شہادت کی مصیبت اتنی بڑی تھی کہ پہاڑ بھی جھک گئے تھے۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے احبار اہلِ کتاب! اللہ کی طاعت، اس کی معصیت سے باز رہنے، نماز قائم کرنے اور اللہ کی خوشنودی اور رضا کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد تمھارے لئے بہت دشوار اور کٹھن ہے، البتہ جو لوگ متواضع ہیں، اللہ کی طاعت کیلئے جھکتے ہیں، اور اس کے خوف سے لرزتے کانپتے رہتے ہیں ان کے لئے کچھ دشوار نہیں

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ "(جنھیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا بھی ہے) "اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ"، "ظن"، شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اہل عرب میں تاریکی کے لئے بھی "سدفۃ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور روشنی کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مدد کرنے والے کو بھی "صارخ" کہتے ہیں اور مدد چاہنے والے کو بھی۔ اس کے علاوہ اور بکثرت ایسے الفاظ عربی میں موجود ہیں جس میں ایک لفظ دو متضاد چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح "ظن" بھی یقین اور شک دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اشعارِ عرب میں اس کے لئے لاتعداد شواہد ہیں کہ "ظن" یقین کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں وَرَاَى الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (اور جب مجرموں نے دوزخ دیکھی تو انھیں یقین ہوگیا کہ وہ اس میں ڈالے جائیں گے)۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ "يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ" میں "ظن" یقین کے معنیٰ میں ہے۔ مجاہد

رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی "ظن" استعمال ہوا وہ یقین کے معنی میں ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "یظنون" "یستیقنون" (یقین رکھتے ہیں) کے معنی میں ہے۔ ابن جریج اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی یقین ہی کے معنی منقول ہیں۔

"انھم ملقوا ربھم" یہاں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ملقوا ربھم میں ملقون کی اضافت نون کو حذف کر کے رب کی طرف کی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہوگا "الذین یظنون انھم یلقون ربھم" (جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ سے ملیں گے) لیکن اس مفہوم کی صورت میں کلام عرب کا قاعدہ یہ ہے کہ اضافت نہیں کرتے بلکہ نون کو باقی رکھتے ہیں۔ صرف ان اسماء مبنیہ میں اضافت کرتے ہیں جو فعل (ماضی) کے معنی میں ہو، اگر وہ "یفعل" (مضارع) یا "فاعل" کے معنی میں ہو تو نون کو باقی رکھتے ہیں اور اضافت نہیں کرتے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، بلکہ لغت عرب کے تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ فعل سے نکلا ہوا اسم اگر مبنی ہو تو اس کی اضافت اور نون کا حذف صحیح ہے خواہ وہ یفعل یا فاعل کے معنی میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے یہ اعتراض ہی سرے سے غلط ہے۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ میرے عہد کو پورا کرتے وقت صبر اور نماز سے مدد چاہو، اور نماز بہت گراں ہے، لیکن میری سزا سے ڈرنے والوں، میرے حکم کے سامنے جھکنے والوں، اور میری ملاقات کا یقین رکھنے والوں کے لئے نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ نماز گراں گذرتی ہے، لیکن خشوع رکھنے والوں پر نہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور جزا و سزا پر سرے سے یقین ہی نہیں رکھتے، ان کے لئے ظاہر ہے کہ نماز اضاعتِ وقت اور تھکا دینے والا عمل ہوگا، کیونکہ انھیں اس سے کسی نفع کی توقع نہیں، نہ اسے پڑھنے سے ان کے نزدیک کوئی نقصان دور ہوتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان پر نماز گراں ہوگی۔ البتہ جو مومن ہیں، اللہ کی ملاقات پر یقین رکھتے ہیں، امیدوار ہیں کہ نماز پڑھنے پر اللہ کی بارگاہ سے انھیں پورا پورا ثواب ملے گا۔ اور اگر اسے ضائع کر دیا اور اس کی ادائیگی نہ کی تو اس کی طرف سے اس کے بدلے میں عذاب مقرر ہے، ظاہر ہے کہ نماز ان پر قطعاً گراں نہیں گذر سکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہودیوں کے علماء کو خاص طور سے مخاطب کیا کہ اگر وہ واقعی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ سے انھیں ملنا ہے اور اسی کے پاس جانا ہے تو نماز قائم کریں، اور اس کے بدلے میں اس سے ثواب کی امید رکھیں۔

وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ (اور اس کا کہ انھیں اسی کی طرف واپس ہونا ہے)

"اَنَّھُمْ" میں "ھم" کی ضمیر "الخٰشِعِیْنَ" کی طرف لوٹتی ہے۔ اور "الیہ" کی ضمیر "رب" کی طرف لوٹتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز گراں ہے، لیکن خشوع رکھنے والوں اور ان لوگوں پر گراں نہیں ہے جو یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اللہ کی طرف واپس جانا ہے۔

ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انھم الیہ راجعون ۝ میں "رجوع" (واپس ہونے) سے مراد موت کے بعد اللہ کے یہاں واپس جانا ہے۔ "رجوع" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، لیکن میرے نزدیک یہی تفسیر زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ (تم اللہ کا کفر کیسے کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھیں موت دی، پھر تمھیں زندہ کرے گا اور پھر تمھیں اسی کی طرف واپس جانا ہے) یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ موت کے بعد پھر زندہ ہو کر وہاں سب کو واپس جانا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ اس لئے اس آیت میں بھی یہی مفہوم مراد لیا جائے گا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

(یعنی) اے اولاد یعقوبؑ کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی اور اس (بات) کو یاد کرو کہ میں نے تم کو تمام

الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

دنیا جہان والوں (خاص برتاؤ میں) فوقیت دی تھی۔ اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہے اور نہ کسی شخص کی

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ

طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے۔ اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرفداری چل سکے گی۔ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ

مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ

رہائی دی ہم نے تم کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری سخت آزادی کے۔ گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد ذکور کے اور

يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو اس (واقعہ) میں ایک امتحان تھا تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کی تفسیر پہلے گذر چکی

دنیا جہان میں سب سے افضل

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (اور میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی)، بنی اسرائیل پر اللہ کی بہت سی نعمتوں میں سے یہ بھی ایک انعام ہے اُنی فضلتکم علی العالمین سے مراد ہے کہ تمہارے اسلاف اور تمہارے بزرگوں کو فضیلت دی، جو انعامات اور احسانات اسلاف پر اللہ تعالیٰ نے کئے تھے انھیں اس طرح بیان کیا کہ گویا یہ انھیں پر ہوئے تھے، کیونکہ اسلاف اور بزرگوں کی عزت اور ان کے مفاخر ان کی اولاد کے لئے بھی باعث فخر ہوتے ہیں، اور آباء و اجداد پر احسانات کا ان کی نسل کو بھی ممنون ہونا چاہیئے یہ بھی انھیں کی شاخ اور پودے ہیں۔ آیت میں "میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی" عام بیان کیا گیا ہے حالانکہ اس سے مراد صرف اس زمانے کے لوگ ہیں جن میں وہ موجود تھے، چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے انھیں اس طرح دی تھی کہ انھیں حکومت و سلطنت عطا کی تھی، ان میں رسول اور انبیاء پیدا کئے تھے اور ان پر آسمانی صحیفے نازل کئے تھے۔ عالمین سے مراد اسی زمانے کے دنیا جہان والے ہیں، کیونکہ ہر زمانہ ایک الگ "عالم" ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے، ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے آپ نے اس کے ثبوت میں یہ آیت تلاوت کی" وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (ہم نے بنی اسرائیل کو دنیا جہان والوں پر فضیلت اپنے علم کے ماتحت دی تھی)، فرمایا کہ یہ فضیلت ان لوگوں کو ملی تھی جنھوں نے اللہ کی اطاعت کی تھی، اس کے حکم کی اتباع کی تھی، اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرتے رہتے تھے۔ ہمارا یہ دعویٰ کہ بنی اسرائیل کو ایک مخصوص زمانے میں دنیا جہان والوں پر فضیلت حاصل رہی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے فرمایا" ہاں تم نے ستر امتوں کی تکمیل کر دی ــ اور تم سب سے آخری اور اللہ کے نزدیک

سب سے افضل امت ہوئے" اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو امت محمدیہ پر تفضیلت حاصل نہیں ہے۔ اور انی فضلتکم علی العالمین سے اسی زمانے کے بنی اسرائیل مراد ہیں۔

جس دن کوئی ساتھ نہ دے گا وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا۔ یعنی اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کے حق میں بدلہ نہ بن سکے گا۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے مخاطبین کو قیامت کے دن کی سزا سے ڈرایا ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا جب کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کچھ بھی کارآمد نہ بن سکے گا۔ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ بدلہ دے سکے گا اور نہ بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کوئی بدلہ بن سکے گا۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ سے واتقوا یوما لا تجزی الآیۃ کی تفسیر میں منقول ہے کہ کوئی بدلہ نہ بن سکے گا کہ بے نیاز ہو جائے، کلام عرب میں جزاء کے اصل معنی ادا کرنا اور بدلہ دینا ہے بولتے ہیں جَزَيْتُهُ قَرْضَهُ یعنی میں نے اسکا قرض ادا کر دیا۔ جزی اللہ فلانا عنی خیرا وشرا۔ یعنی میرے ساتھ بھلائی یا برائی کا جو معاملہ فلاں شخص نے کیا ہے اللہ اسے اس کا بدلہ دے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ جزاء ادا کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اجزاء مکافات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (کیونکہ آیت میں لاتجزی جزاء سے ہے)، اس لئے مفہوم یہ ہوگا کہ اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کی طرف سے کچھ ادا نہ کر سکے گا۔ اور نہ اسے بے نیاز کر سکے گا۔ یعنی اس دنیا میں، بیٹا، باپ، دوست و احباب اور رشتہ دار جس طرح قرض کی ادائیگی کا بار اپنے سر لے لیتے ہیں، آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ وہاں کے متعلق جو کچھ احادیث سے ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ انسان کی نیکی اور برائی ہی اس کی خوشی کا باعث بنے گی۔

چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جس کا اس کے کسی بھائی پر عزت، مال یا جاہ کے سلسلے میں کوئی حق تھا[1] اور اس کی ادائیگی سے پہلے وہاں آگیا جہاں نہ درہم ہوں گے نہ دینار (یعنی آخرت میں)، کہ اس وقت اگر اس نے کچھ نیک کام کئے ہونگے تو اس کی نیکی کا ثواب اس شخص کو دے دیا جائے گا (جس کا اس پر حق تھا) اور اگر اس نے کوئی نیکی نہیں کی تو حق والے کے گناہ اسے دیدیئے جائیں گے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" کوئی شخص قرض کی ادائیگی سے پہلے نہ مرے کہ وہاں نہ دینار ملیں گے نہ درہم، وہاں تو صرف نیکیاں اور برائیاں تقسیم کی جائیں گی،" یہ ارشاد فرماتے ہوئے حضور اکرم نے اپنے ہاتھ سے دائیں اور بائیں طرف اشارہ کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کی طرح ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "ولا تجزی نفس عن نفس شیئا" کا مطلب ہے کہ آخرت میں بدلہ اس چیز سے نہیں دیا جائے گا جو دنیا میں اس پر لازم تھا بلکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا وہاں جزاء اور بدلہ صرف حسنات وسیئات کی صورت میں ہی دیا جا سکتا ہے۔

بصرہ کے بعض نحویوں نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "یہ کافی نہیں ہوگا کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی جگہ پر دیجائے" لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں، قرآن کی ظاہری ترتیب کے بھی خلاف ہے اور کلام عرب میں بھی اس طرح کا کوئی استعمال نہیں، ولا یقبل منھا شفاعۃ، میں شفاعۃ مصدر ہے۔ بولتے ہیں " شفع لی فلان الی فلان شفاعۃ " یعنی فلاں نے فلاں سے میری ضرورت پوری کرنے کے لئے کہا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کا بھی حق اپنی طرف سے ادا نہیں کر سکے گا۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کی شفاعت (سفارش)، ہی قبول کریں گے کہ اس کے کہنے سے حق

---

[1] یعنی اس کی ۔۔۔ بے عزتی کی تھی یا اس کا مال زبردستی لے لیا تھا، یا قرض لیا تھا اور نہیں ادا کیا، پھر اس کی ادائیگی سے پہلے ہی مر گیا۔ مترجم

واجب چھوڑ دیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود بنی اسرائیل کو مخاطب کیا ہے ، وہ کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے ، اللہ کے محبوب اور اس کے انبیاء کی اولاد ہیں ، اور ہمارے اسلاف اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا کہ قیامت میں کوئی کسی کی طرف سے بدلہ نہیں دے گا ، اور نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی ، بلکہ ہر صاحب حق کو اس کا پورا پورا حق ملے گا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن بغیر سینگ کی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لے گی ۔ اگر اس نے اپنے سینگ سے اسکو مارا ہوگا ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے " اور ہم رکھیں گے ترازو انصاف کے ساتھ قیامت کے دن ، پس نہ ظلم کرے گا کوئی نفس کچھ بھی " ۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو بالکل مایوس کر دیا ، اپنے بارے میں جو ان کا دعویٰ تھا کہ حق کو پہچاننے کے بعد اسے جھٹلانے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے سلسلے میں اللہ کے حکم کی مخالفت کے باوجود وہ اللہ کے عذاب سے نجات پا جائیں گے قطعاً بے بنیاد ہے ۔ یہ بھی غلط ہے کہ ان کے ان کرتوتوں کے باوجود ان کے اسلاف کی شفاعت انھیں حاصل ہوگی ۔ ہاں اگر کوئی چیز انھیں نفع پہنچا سکتی ہے تو وہ کفر سے توبہ اور گمراہی سے رجوع ہے ۔

یہ آیت اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن حکم اور مفہوم میں عام نہیں ۔ کیونکہ تواتر کے ساتھ شفاعت کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہم تک پہنچی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ میری شفاعت میری امت میں گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد کے لئے ہوگی ، ایک موقع پر آپ نے فرمایا ، ہر نبی کو ایک دعا دی گئی کہ جب انھوں نے وہ دعا کی تو قبول ہوئی ، اور میں نے اپنی دعا کو اپنی امت کی شفاعت کے لئے محفوظ کر لیا ہے ، میری یہ شفاعت میری امت کے ان تمام افراد کے لئے ہوگی جنھوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوگا ۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے اپنے مومن بندوں کے بہت سے گناہوں کی سزائیں معاف کر دیں گے ، جن کا تعلق اللہ اور بندے سے ہوگا اور یہ کہ آیت وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ صرف ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے موت سے پہلے کفر سے توبہ نہیں کی ہوگی ۔ اس موقع پر ہم اس بحث کو طول نہیں دیں گے مفصل بحث انشاء اللہ اپنے موقع پر آگے آئے گی ۔ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا) عدل کلام عرب میں فدیہ (معاوضہ) کے معنی میں آتا ہے ۔ ابو العالیہ ، قتادہ ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے یہی منقول ہے ، ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت میں یہ معنی نقل ہوئے ہیں ۔ حضور اکرمؐ سے پوچھا گیا " یا رسول اللہ ! عدل کیا چیز ہے ؟ " آپؐ نے فرمایا " فدیہ " (معاوضہ) ۔ فدیہ اور معاوضہ کو عدل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اس کے برابر ، اور اس کے باوجود کہ اصل کی جنس سے نہیں ہوتا لیکن اسی جیسا ہوتا ہے ، جو عدل کا مفہوم ہے ، یعنی یہ مشابہت صورۃً نہیں بلکہ جزاء اور بدلہ بننے کی حیثیت سے ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا میں بھی یہی مفہوم ہے ، یعنی اگر ہر طرح کا معاوضہ وہ دیں بھی تو قبول نہ کیا جائے گا ۔ اگر اسی کی جنس سے کوئی چیز اس کے مماثل اور برابر ہو تو اس کے لئے " عِدل " (بکسر عین) استعمال کیا جاتا ہے ، بولتے ہیں عندی غلام عِدلُ غلامك (میرے پاس ایک غلام ہے جو تمھارے غلام جیسا ہے) یا " عندی شاۃ عِدلُ شاتك " (میرے پاس ایک بکری ہے جو تمھاری بکری جیسی ہے) لیکن اگر مماثلت صرف قیمت اور حیثیت میں ہو تو اس کے لئے " عَدل " (بفتح عین) استعمال ہوتا ہے ، بولتے ہیں " عندی عدل شاتك من الدراهم " (میرے پاس تمھاری بکری کے برابر درہم ہیں) " وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ " یعنی اس دن کوئی مدد کرنے والا ان کی مدد کو نہ پہنچے گا جس طرح کوئی شفاعت کرنے والا اس دن ان کی شفاعت نہ کرے گا اور نہ ان کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا ۔ شفاعت و سفارش کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے ، اور فیصلہ کا حق صرف اللہ عادل و جبار کو ہوگا ۔ وہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی سے دے گا ۔ اور نیکی کا بدلہ کئی گنا بڑھا کر دے گا یہی مضمون اس آیت میں بھی بیان ہوا ہے " وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ۔ (اور ان کو ذرا ٹھہراؤ ، ان سے پوچھ گچھ ہوگی ، اب تمھیں کیا ہو گیا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ، انہیں بلکہ وہ اس روز سرافگندہ ہوں گے)

ابن عباسؓ نے "لا تناصرون" کی تفسیر فرمائی ہے کہ "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ہماری طرف سے مدافعت نہیں کرتے افسوس کیا آج تمہیں یہ حق حاصل نہیں رہا۔ بعض حضرات نے "ولا ہم ینصرون" کا مطلب یہ بتایا ہے کہ معاوضے اور شفاعت کے سلسلہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس کی پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے مخاطب لوگوں کو بتایا ہے کہ قیامت کے دن، جس دن اس شخص کے بارے میں کسی معاوضے کا سوال پیدا ہوگا جو اللہ کے عذاب کا مستحق ہوگا، نہ اس کے حق میں کسی کی کوئی شفاعت کام آئے گی اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔ یہ تفصیل اس لئے کی کہ دنیا میں یہ چیزیں کارآمد تھیں، اس لئے ان پر واضح کر دیا کہ قیامت کے دن یہ سب چیزیں ختم ہو جائیں گی ان کے حصول کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا۔[1]

ہم نے تمہیں نجات دی تھی

"واذ نجیناکم من آل فرعون"۔ "اذ نجینا" کا عطف "یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی" پر ہے۔ گویا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ میرے انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے، اور میرے اس انعام کو بھی یاد کرو جب میں نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی تھی" آل فرعون" سے مراد اس کے دین کے ماننے والے، اس کی قوم، اور اس کی اتباع کرنے والے ہیں "آل" کی اصل "اہل" ہے "ہا" ہمزہ سے بدل گیا ہے۔ "ماء" میں بھی اسی طرح "ہا" ہمزہ سے تبدیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ تصغیر کے وقت "مُوَیْہٌ" بولتے ہیں اور "آل" کی تصغیر "اہیل" آتی ہے۔ تصغیر کے وقت اصل حروف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اہل سے "آل" کی تصغیر "اویل" بھی منقول ہوئی ہے۔ "آل" کا استعمال مشہور ناموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ آلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ آلِ علی۔ آلِ عباس۔ آلِ عقیل بولتے ہیں۔

غیر معروف ناموں کے ساتھ اس لفظ کا استعمال مناسب نہیں خیال کیا جاتا۔ اسی طرح شہر اور ملک یا اسی جیسی چیزوں کے ساتھ بھی یہ لفظ نہیں استعمال کیا جاتا۔ مثلاً "آل الرجل"۔ "آل المرءۃ، آل البصرۃ۔ آل الکوفۃ" استعمال نہیں ہوتا۔ "آل مکہ" اور "آل مدینہ" کا استعمال عربوں سے سنا گیا ہے لیکن عام طور سے مستعمل نہیں ہے" فرعون" مصر کے عمالقہ بادشاہوں کا لقب تھا۔ جیسے روم کے بادشاہوں میں بعضوں کا لقب "قیصر" اور بعضوں کا "ہرقل" تھا۔ فارس کے بادشاہ "کسریٰ" لقب رکھتے تھے۔ یمن کے بادشاہ "تبّع" کہلاتے تھے۔ "فرعون موسیٰ" جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ اس کے عذاب سے بنی اسرائیل کو اس نے نجات دی تھی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ ابن اسحاق نے اس کا یہی نام نقل کیا ہے۔

آیت میں جن لوگوں سے خطاب ہے انھوں نے فرعون کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ اور نہ انھیں اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات دلائی تھی۔ لیکن انھیں خطاب اس لئے ہوا ہے کہ یہ ان کی اولاد تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات دلائی تھی۔ گویا آباء اور اسلاف پر جو انعامات کئے تھے ان کی نسبت ان کی اولاد کی طرف کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے کفران نعمت کی نسبت بھی ان کی اولاد کی طرف کی گئی ہے۔ اس طرح کے خطاب عام ہیں۔ "یسومونکم سوء العذاب" (جو تمہارے اوپر بڑا عذاب توڑ رہے تھے) "یسومونکم" کی ترکیب دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ اسے فرعون بنی اسرائیل سے خبر مستانف قرار دیا جائے۔ اس ترکیب کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ "میرے

---

[1] یعنی جب وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہی نہیں ہو سکتیں تو پھر اس کا سوال بھی باقی نہیں رہتا کہ کوئی دوسرا ان کے لئے معاوضہ دے یا مدد کرے اور اسے قبول نہ کیا جائے۔

انعامات کو اپنے اوپر یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی وہ اس سے پہلے تمہارے اوپر عذاب توڑا کرتے تھے۔ اس صورت میں "یسومونکم" موضع رفع میں ہوگا۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ "یسومونکم" کو حال مانا جائے۔ اس ترکیب کے مطابق آیت کا مفہوم یوں ہوگا "اور جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو تم پر عذاب توڑا کرتے تھے" گویا "یسومونکم" آل فرعون سے حال واقع ہوا ہے "یسومونکم" کا لفظی ترجمہ "یوردونکم، یذیقونکم، ویولونکم" (تم پر توڑا کرتے تھے، تمہیں چکھایا کرتے تھے) ہے۔ "سوء العذاب" یعنی ایسا عذاب جو انھیں ناگوار گزرتا تھا۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "شدید ترین عذاب" کیا ہے۔ لیکن اس معنی کے مطابق "اسوء العذاب" ہونا چاہیئے تھا۔ فرعون جو عذاب انھیں دیا کرتا تھا اسکی ایک تفصیل تو آگے ہی آرہی ہے کہ "تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے" اس کے علاوہ فرعون کے عذاب کے سلسلے میں ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل سے بیگار لیا کرتا تھا۔ ان پر اس نے مختلف طرح کے کام تقسیم کر دیئے تھے۔ بعضوں کے ذمہ تعمیرات کا کام تھا۔ بعض کھیتی کیا کرتے تھے۔ ہر طبقہ کو اپنے اپنے کام میں لگا رہنا پڑتا تھا اور اگر بنی اسرائیل کا کوئی شخص اس کے کسی کام پر نہ لگا ہوا ہوتا تو اس سے تاوان وصول کرتا۔ "سوء العذاب" سے ان کے انھیں مصائب کی طرف اشارہ ہے۔ "یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم" (فرعونی تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے) فرعونیوں کے عذاب توڑنے، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دینے کی نسبت ان آیات میں فرعون کی طرف نہیں بلکہ آل فرعون کی طرف کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ فرعون کے حکم سے اس کی قوت و سلطنت کی پشت پر ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ ان اعمال کو انجام دینے والے دوسرے افراد تھے اس لئے براہ راست ان کے کرنے والوں کی طرف نسبت کی کہ یہی مناسب بھی تھا۔ ہمارے یہاں اس آیت کی نسبت کے مطابق یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو، کسی تیسرے شخص کے حکم یا اس کی زبردستی کرنے پر قتل کر دے تو قصاص میں اس شخص کو قتل کیا جائے جسنے قتل کا ارتکاب کیا ہوگا۔ قتل کا حکم دینے والے یا زبردستی کرنے والے سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ آیت میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دینے کا جو تذکرہ ہے اس کی تفصیل ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ فرعون کے دربار میں ایک مرتبہ اس وعدہ کا تذکرہ ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا کہ ان کی نسل میں انبیاء اور بادشاہ پیدا کرے گا اس لئے تمام درباریوں کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ چند افراد کی ایک جماعت بنی اسرائیل کے پاس بھیجی جائے ان کے ساتھ شفار ہوں۔ یہ جماعت بنی اسرائیل کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے اور جس گھر میں بھی کوئی نومولود بچہ مل جائے اسے قتل کر دے۔ چنانچہ یہ کام شروع ہوگیا۔ پھر جب ان کے سامنے یہ صورت حال آئی کہ بنی اسرائیل کے مرد اپنی عمر طبعی پوری کر کے ختم ہو رہے ہیں اور بچوں کو وہ خود ذبح کر دیتے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ اس سے تو بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ کیونکہ (جب وہ نہیں رہیں گے تو) جو کام وہ کیا کرتے تھے اب انھیں خود انجام دینا پڑا کرے گا۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ ایک سال کے بچوں کو قتل کیا جائے اور دوسرے سال کے بچوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔

اس پر بھی عمل شروع ہوگیا۔ اتفاق سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے یہاں جس سال ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ یہ سال تھا جس میں بنی اسرائیل کے بچوں کی جان بخشی کا حکم تھا۔ اس لئے ہارون علیہ السلام کی پیدائش کو چھپایا نہیں گیا۔ لیکن دوسرے سال موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے (یہ سال ان کے بچوں کے قتل کی باری کا سال تھا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو پوشیدہ رکھا گیا)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت میں نقل ہوا ہے کہ کاہنوں نے فرعون کو بتایا تھا کہ اس سال ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری سلطنت کے خاتمہ کا سبب بنے گا۔ بیان کیا کہ پھر فرعون نے ہر ہزار عورتوں پر سو مرد متعین کر دئیے۔ یعنی دس عورتوں پر ایک مرد۔ اور انھیں حکم دیا کہ شہر میں جتنی عورتیں حمل سے ہیں سب کی نگرانی کریں، جب بچہ پیدا ہو جائے تو دیکھیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اگر لڑکا ہے تو اسے ذبح کر دیں اور اگر لڑکی ہے تو چھوڑ دیں۔ "یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم وفی ذالکم بلاءٌ من ربکم عظیم" میں اسی واقعہ کا بیان ہوا ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ فرعون کی سلطنت مصر میں چار سو سال تک رہی تھی۔ پھر کاہنوں نے بتایا کہ اس سال مصر میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تمہاری ہلاکت ہوگی۔ چنانچہ اس نے مصر کی تمام عورتوں پر اپنی طرف سے دائیوں کو بھیجا۔ اگر کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ فرعون کے پاس لایا جاتا اور وہ اسے قتل کر دیتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ فرعون نے خواب دیکھا تھا کہ ایک آگ بیت المقدس کی طرف سے آئی جس نے مصر کے تمام گھروں کو گھیر لیا۔ پھر قبطیوں کے (جو مصر کے اصل باشندے تھے اور جن میں سے فرعون بھی تھا) تمام گھروں کو اس نے جلا دیا اور بنی اسرائیل کے گھروں کو چھوڑ گئی۔ مصر کے تمام گھرانے برباد ہو گئے۔ صبح کو اس نے ساحروں، کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں کو بلایا اور ان سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ اس شہر سے جہاں سے بنی اسرائیل آئے ہیں۔ ان کا اشارہ بیت المقدس کی طرف تھا (جہاں کے بنی اسرائیل اصل باشندے تھے) ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں مصر والوں کی تباہی ہوگی۔ اس پر فرعون نے حکم جاری کیا کہ بنی اسرائیل کے یہاں جو بھی بچہ پیدا ہوا ہے قتل کر دیا جائے۔ البتہ لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ قبطیوں کو یہ حکم دیا کہ تمہارے جو غلام باہر کام کرتے ہیں انھیں بلالو اور ان کے بجائے ذلیل کاموں پر بنی اسرائیل کو لگا دو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ذمہ نہایت ذلیل کام سونپ دیئے گئے اور غلاموں سے وہ کام لینا بند کر دیا گیا۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا" یعنی فرعون ملک میں بہت کبر و غرور کا مظاہرہ کرنے لگا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کیونکہ اس نے بنی اسرائیل کو ذلیل کاموں پر لگا رکھا تھا اور ان کی جماعت کو کمزور کرنے کے لئے یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو بھی لڑکا ان کے یہاں پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس طرح جو بچہ پیدا ہوتا اسے قتل کر دیا جاتا اور کسی کو زندہ رہنے نہ دیا جاتا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھے جلدی جلدی مرنے لگے۔ اب قبطیوں کے سردار فرعون کے پاس گئے اور اس سے اس صورت حال پر گفتگو ہوئی انھوں نے کہا کہ ان میں جو بڑے تھے وہ سب ختم ہوتے جا رہے ہیں، اگر ان کے لڑکوں کو قتل کرنا جاری رہا تو کام کا سارا بار ہمارے غلاموں پر آپڑے گا۔ مناسب ہے کہ آپ ان کی نرینہ اولاد میں بھی کچھ زندہ رہنے دیں۔ چنانچہ فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال کے پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور اس کے بعد آنے والے سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل نہیں کیا جانے والا تھا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اس سال ہوئی جس سال ان کے نومولود لڑکوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے فرعون کے لڑکوں کو مار ڈالنے کے سلسلہ میں روایت ہے کہ اس کے حکم سے بانسوں کو چھیل کر چھری کی طرح کر لیا جاتا اور انھیں ایک دوسرے سے متصل بچھا دیا جاتا۔ پھر بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کو لا کر ان پر کھڑا کر دیا جاتا جس سے ان کے پاؤں پھٹ جاتے۔ اسی حالت میں وضع حمل ہو جاتا تو بانسوں کی دھار کی تکلیف سے

بچنے کے لئے عورتیں اپنے بچوں ہی پر پاؤں رکھ دیتیں۔ کیونکہ اس تکلیف کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بڑے انہماک کے ساتھ فرعون نے اس مشغلہ کو جاری رکھا اور جب بنی اسرائیل کی نسل فنا کے قریب پہونچ گئی تو درباریوں نے اس سے کہا کہ آپ نے ان کی ساری نسل بھی ختم کر ڈالی حالانکہ وہ آپ کے خادم اور بیگار ہیں۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ ایک سال پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کیا جائے اور اس کے بعد دوسرے سال پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ الخ۔

ان تمام اقوال کی بنیاد پر "ویستحیون نساء کم" کا مطلب ہوگا۔ "یَسْتَبْقُوْنَ نِسَاءَ کُمْ" (یعنی تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے) اور جیسا کہ ان روایتوں کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے وقت جب دیکھتے کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ جائز ہے کہ بچپن میں اور ولادت کے بعد لڑکی اگر ہو تو اس پر "امرءۃ" (عورت) کا اطلاق کر دیا جائے (امرءۃ، نساء کا واحد ہے) لیکن ابن جریج رحمہ اللہ نے اس تفسیر کو صحیح نہیں تسلیم کیا، انھوں نے فرمایا کہ "یستحیون نساء کم" کا مطلب ہے "یسترقون نساء کم" (تمہاری عورتوں کو غلام بنا لیتے تھے) لیکن عرب وعجم کی کسی زبان میں "استحیار" (زندہ رہنا) "استرقاء" (غلام بنانا) کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا، ان میں باہم کوئی ربط اور جوڑ ہی نہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "یذبحون ابناء کم" (تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے) کا مطلب یہ ہے کہ تم میں جو مرد تھے انھیں قتل کر دیتے تھے کہ وہ بھی بہر حال کسی کے بیٹے ہی تھے (اور اس طرح ابنار (بیٹوں) کا استعمال بھی غلط نہیں ہوگا) انھوں نے یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ چھوٹے بچوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ آگے "نساء" (عورتوں) کو زندہ رہنے دینے کا ذکر ہے (جس کا اطلاق لڑکیوں پر بالغ ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے) اس لئے اس کی مناسبت سے "ابناء" (لڑکوں) سے مراد بھی "رجال" (مرد) لئے جائیں گے۔ یہ تفسیر کسی صحابی یا تابعی رضوان اللہ علیہم سے ثابت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس واقعہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف اپنی وحی کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب نومولود موسیٰ علیہ السلام کو تابوت میں رکھ کر دریا میں بہا دینے کے لئے ان کا دل تیار نہ ہوا اور انھیں بچے کی طرف سے خوف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہی دودھ پلائیں گی۔ ظاہر ہے کہ جب فرعونی مردوں کو قتل کرتے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو آخر کیا پڑی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو تابوت میں رکھ کے دریا میں بہا لے جائیں۔ یا موسیٰ علیہ السلام بڑے مرد تھے اور ان کی ماں کے انھیں تابوت میں رکھنے کے واقعہ ہی سے انکار کر دیا جائے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی خود اطلاع دی ہے)

ہمارے نزدیک ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر زیادہ بہتر ہے۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ فرعونی بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے "نساء" (عورتوں) کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ نہ اس جنس کے چھوٹوں کو وہ قتل کرتے تھے اور نہ بڑوں کو، یعنی نہ لڑکی پیدا کرنے والی مائیں ماری جاتی تھیں اور نہ نئی پیدا ہونے والی لڑکیاں! اور ان سب کے مجموعہ پر "نسار" (عورتوں) کے اطلاق میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ نرینہ جنس میں صرف نئے پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ:-
"یذبحون ابناء کم" (تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتے تھے) یہاں "رجال" (مردوں) کا استعمال صحیح نہیں ہوتا "وفی ذالکم بلاء من ربکم عظیم" (اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بڑی نعمت تھی)

مطلب یہ ہے کہ بعض فرعونیوں نے تم پر عذاب توڑ رکھے تھے، ہم نے تمہیں اس سے نجات دی۔ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری یہ نجات تمہارے لئے بڑی آزمائش تھی۔ یعنی ایسی آزمائش جو نعمت حاصل ہونے کے بعد ہوتی ہے (کہ اس کے حقوق پوری طرح ادا کرتا ہے یا نہیں؟) ابن عباس، سدی، مجاہد، ابن جریج رضی اللہ عنہم سے یہی نقل ہے کہ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے بڑی نعمت تھی "بلاء" کا اصل مفہوم کلام عرب میں "جانچنا" "امتحان لینا" ہے چنانچہ جس طرح شر کے ذریعہ ہوتا ہے، خیر کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ — اور ہم انھیں خوش حالیوں اور بد حالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید وہ باز آجائیں۔

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے "ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ" (اور ہم تم کو آزماتے ہیں بھلائی اور برائی سے خوب طرح) پھر اہل عرب براہ راست "خیر" کو بھی "بلاء" کہنے لگے اور "شر" کے لئے بھی "بلاء" کا استعمال کرنے لگے

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

اور وہ زمانہ یاد کرو) جب (کہ) شق کر دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریائے شور کو بھی۔ ہم نے ڈوبنے سے بچالیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

اور فرعون غرق آب ہوا

"واذ فرقنا بکم البحر" کا عطف "واذ نجینکم" پر ہے۔ یعنی میرے انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑ دیا تھا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سمندر میں بھی بارہ راستے بنا دیئے پھر ہر قبیلے نے الگ الگ اپنے اپنے راستے سے چل کر سمندر پار کیا "سمندر کو پھاڑنے" سے یہی مراد ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ بصرہ کے بعض نحویوں نے "فرقنا بکم" کا ترجمہ "فرقنا بینکم وبین الماء" کیا ہے یعنی جب تم سمندر پر سے گذرے تو ہم نے تمہارے اور پانی کے درمیان فصل اور پردہ کر دیا (کہ پانی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکا) لیکن یہ تفسیر آیت کی ظاہری ترتیب کے خلاف ہے۔ آیت میں قوم بنی اسرائیل کے لئے دریا کو پھاڑنے اور جدا کرنے کا ذکر ہے، اس کا کوئی تذکرہ نہیں کہ قوم اور پانی کے درمیان جدائی کر دی تھی۔ اس لئے سمندر کی تفریق کی وہی صورت صحیح ہے جو ہم نے بیان کی اور جو روایات سے ثابت ہے۔ "فانجینا کم واغرقنا آل فرعون" (پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعون والوں کو غرق کر دیا)

ۓ سالہا سال تک فرعون کے مظالم برداشت کرنے کے بعد آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو جانا طے کر لیا تھا۔ سفر چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع ہوا۔ لیکن اندھیرے میں بنی اسرائیل راستہ بھول گئے اور اس کے بجائے کہ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں پر مشرق کی طرف بڑھتے پہلے ہی ادھر گھوم گئے۔ ادھر فرعون کو ان کے فرار کی اطلاع مل گئی اور وہ اپنے لشکر کی کمان خود کر تا تیزی سے تعاقب میں آپہنچا۔ اب بنی اسرائیل کے سامنے عین مشرق کی جانب سمندر تھا۔ دائیں بائیں یعنی شمال و جنوب میں پہاڑیاں تھیں اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر!۔ ان آیات میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے (مترجم)

عبداللہ بن شداد بن الھاد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فرعون ستر ہزار سواروں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلا، موسیٰ علیہ السلام بھی آگے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ سمندر سامنے آگیا اور اس میں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا ادھر پیچھے سے فرعون بھی اپنے لشکر کے ساتھ دکھائی دیا۔ جب دونوں لشکروں کی ایک دوسرے پر نظر پڑی تو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب ہم پکڑے جائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے اور وہی مجھے نجات دے گا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ اس سلسلہ میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف وحی بھیجی کہ جب موسیٰ علیہ السلام تم پر اپنا "عصا" (ڈنڈا) ماریں تم ان کے لئے پھٹ جانا (اور بنی اسرائیل کو راستہ دیدینا) بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کرنے کے انتظار میں اور اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے سمندر ٹھاٹھیں لینے لگا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا "عصا" سمندر پر ماریں۔ چنانچہ جب انھوں نے مارا تو جیسا کہ اللہ کا حکم تھا سمندر پھٹ گیا اور جہاں بھی آپ نے مارا تھا وہاں زمین کی خشک پہاڑی کی طرح بن گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا "پھر ان کے لئے سمندر میں عصا مار کر راستہ بنا لینا، تم کو نہ پالئے جانے کا اندیشہ ہوگا اور نہ کوئی اور خوف ہوگا۔"

پھر جب سمندر میں خشک راستے بن گئے تو موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر اس میں سے روانہ ہوئے۔ ادھر پیچھے سے فرعون بھی اس راستہ پر آگیا۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد سے روایت ہے کہ جب بنی اسرائیل کا پورا قافلہ سمندر میں سے گذرنے لگا اور کنارے پر ان کا کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا تو فرعون بھی کنارے پر پہنچا۔ وہ اس وقت ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑا سمندر کے کنارے پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا اور سمندر میں بنے ہوئے راستے پر چلنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام نے ایک مادہ گھوڑی اس کے آگے کر دی۔ فرعون کے گھوڑے نے جب اسے سونگھا تو اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب فرعونیوں نے دیکھا کہ فرعون نے سمندر کے راستے پر اپنا گھوڑا ڈال دیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو گئے۔ جبریل علیہ السلام سب سے آگے تھے۔ فرعون کے پیچھے اس کا لشکر چل رہا تھا اور میکائیل علیہ السلام لشکر کے پیچھے پیچھے ایک گھوڑے پر سوار تھے اور کہتے جاتے تھے اپنے بادشاہ کے ساتھ جاملو۔ جب جبریل علیہ السلام اس طرح سمندر کے دوسرے کنارہ پر پہنچ گئے کہ ان کے آگے کوئی فرعونی نہیں تھا اور میکائیل علیہ السلام پہلے کنارہ پر کھڑے ہو گئے کہ آپ کے پیچھے کوئی فرعونی نہیں تھا تو سمندر کو ان پر الٹ دیا گیا۔ جب فرعون نے (موت سے پہلے) اللہ کے سلطان اور قدرت کا مشاہدہ کیا اور اپنی ذلت اور بے بسی بھی سامنے آگئی تو پکار اٹھا کہ "جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے میں بھی اس پر ایمان لایا، اور میں مسلمانوں میں سے ہو گیا۔"[1]

[1] ظاہر ہے کہ اس آخری جزء کے سوا اس روایت کی تمام تفصیلات اسرائیلی ہیں، جن کا اسلامی روایات سے کوئی تعلق نہیں۔ ابن جریر میں اس طرح کی روایات کی کثرت ہے۔ فرعون اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں جتنی روایات انھوں نے نقل کی ہیں ان میں کم ہی قرآن وحدیث سے ثابت ہونگی۔ قدیم مفسرین میں اس طرح کی روایات نقل کرنے کا ایک عام مذاق رہا ہے اس طرح کی روایات کے متعلق ہمیں حکم ہے کہ اگر یہ ہماری شریعت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول صحیح روایات کے خلاف ہیں تو انھیں رد کر دیا جائیگا لیکن اگر خلاف نہیں ہیں تو سکوت اختیار کیا جائے گا۔ نہ رد کیا جائے گا اور نہ قبول! کیونکہ ہمارے لئے تو انھیں چیزوں کا ماننا اور قبول کرنا ضروری ہے جو ہماری شریعت سے ثابت ہیں۔

عمرو بن سمعون اودی رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر نکلے تو فرعون کو اس کی اطلاع ملی، لیکن اس نے حکم دیا کہ جب تک مرغ (سحر کے وقت) اذان نہ دے تم ان کے تعاقب میں نہ نکلو۔ بیان کیا؟ خداگواہ ہے کہ اس رات مرغ نے اذان ہی نہیں دی اور صبح ہوگئی۔ پھر اس نے ایک بکری منگوائی اور وہ ذبح کی گئی۔

فرعون نے حکم دیا کہ اس سے پہلے کہ میں اس کی کلیجی کھانے سے فارغ ہوں چھ لاکھ قبطیوں کا لشکر جمع ہو جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر وہ روانہ ہوئے۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام سمندر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے یوشع بن نون رضی اللہ عنہ نامی ایک صاحب نے پوچھا۔ یا موسیٰ! آپ کو آپ کے رب نے کس طرف جانے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے دریا کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تمہارے آگے کی طرف۔ یوشع بن نون رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ لیکن جب گھوڑا ڈوبنے لگا تو اس میں سے نکل آئے اور پھر پوچھا یا موسیٰ! آپ کے رب نے آپ کو کس طرف چلنے کا حکم دیا ہے؟ خداگواہ ہے کہ انھوں نے جھوٹی بات نہیں بتائی اور حضرت یوشع بن نون نے تین مرتبہ ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ بتایا کہ اپنا "عصا" (لاٹھی) سمندر پر ماریں۔ اس سے سمندر پھٹ گیا اور جہاں جہاں آپ نے مارا تھا پہاڑی کی طرح بڑے بڑے تودے بن گئے۔ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اس راستہ سے روانہ ہوئے۔ فرعون بھی تعاقب کرتا ہوا آگیا اور اس راستے پر چلنے لگا لیکن اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس پر الٹ دیا۔ اسی واقعہ کی طرف آیت میں اشارہ کیا ہے کہ "واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون" (اور ہم نے فرعون والوں کو غرق کر دیا۔ درآں حالیکہ تم دیکھ رہے تھے) قتادہ رح نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے چھ لاکھ آدمی تھے اور فرعون نے آپ کا تعاقب ایک کروڑ دو لاکھ سواروں کے ساتھ کیا تھا۔

ابن عباس رض سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ "اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ" (میرے بندوں (بنی اسرائیل) کو راتوں رات لے جاؤ۔ تمہارا پیچھا کیا جائے گا) بیان کیا کہ اس حکم کے مطابق موسیٰ علیہ السلام راتوں رات انھیں لے کر نکل پڑے۔ ادھر فرعون نے ایک کروڑ لشکر ساتھ لیکر ان کا تعاقب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کل چھ لاکھ افراد تھے۔ چنانچہ جب فرعون نے دیکھا تو کہنے لگا کہ "اِنَّ هٰؤُلَاۗءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَاۗىِٕظُوْنَ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ" (یہ لوگ چھوٹی سی جماعت ہیں اور انھوں نے ہم کو بہت غصہ دلایا ہے اور ہم سب کو ان سے خطرہ ہے) موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر چل رہے تھے آخر سمندر پر پہونچ گئے لیکن پیچھے مڑ کے جو دیکھا تو اپنے کو فرعونی گھوڑوں کی زد میں پایا۔ اب کہنے لگے کہ یا موسیٰ! آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں بڑی تکلیفیں دی گئی تھیں اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔ یہ سمندر ہمارے سامنے ہے اور پیچھے سے فرعون ہمارے قریب پہونچ چکا ہے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا (جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ) عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین کا حاکم بنا دے گا، پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اپنا "عصا" سمندر پر ماریں۔ اور سمندر کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کرے۔ بیان کیا کہ یوشع بن نون رضی اللہ عنہ نے پوچھا، آپ کو، آپ کے رب نے کیا حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ میرے رب کا حکم ہے کہ سمندر پر ماروں، انھوں نے عرض کیا کہ پھر ماریئے۔ بیان کیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس پر مارا تو سمندر پھٹ گیا اور اس میں سے بارہ راستے نکل آئے۔ ہر راستہ بڑے تودہ کی طرح سمندر سے بلند تھا (بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے ایک راستہ بن گیا تھا۔ جب آپ اپنے راستے پر چلنے لگے تو آپس میں

ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا بات ہے ہماری قوم کے تمام لوگ نظر نہیں آرہے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام سے بھی انھوں نے یہی سوال کیا، سب لوگ کدھر گئے نظر نہیں آرہے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ چلے چلو وہ بھی تمہاری ہی طرح الگ الگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ اس پر وہ اصرار کرنے لگے کہ جب تک ہم اپنے تمام ساتھیوں کو دیکھ نہ لیں آگے نہیں بڑھیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عاجز آکر دعا کی کہ اے اللہ! ان کے برے اخلاق کے مقابلہ میں میری مدد کیجیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو گھمائیے۔ ابراہیم (راوی نے) اپنے ہاتھ کو گھما کر بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یوں دریا پر گھمایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب دیواروں پر سے اسے گھمایا تو ان میں سوراخ بن گئے اور اس میں سے وہ ایک دوسرے کو جاتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ ابن عباس رضؓ نے بیان کیا کہ جب وہ سمندر کو پار کر گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا آخری فرد بھی دوسرے کنارے پر اتر گیا تو فرعون اپنے لشکر کے ساتھ تعاقب کرتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا۔ فرعون اس وقت ایک نر گھوڑے پر سوار تھا۔ سمندر پر سے گذرنے کی گھوڑے میں ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے جبریل علیہ السلام نے ایک گھوڑی لاکر اس کے سامنے کھڑی کی جس سے وہ اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ سمندر کو اسی حالت میں چھوڑ دیں کہ اس پر سے گذرنے کا راستہ بنا رہے۔ پھر فرعون اپنے لشکر کے ساتھ سمندر میں اسی راستہ سے داخل ہوا۔ جب تمام لشکر کنارے سے سمندر کے اس راستہ پر آگیا اور موسیٰ علیہ السلام کے تمام افراد سمندر کے راستے کو پار کر گئے تو سمندر الٹ دیا گیا اور فرعون اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ڈوب گیا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت ہے کہ جس رات موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر نکلے تو فرعونیوں کے یہاں اسی رات بکثرت اموات ہوگئیں۔ صبح تک وہ ان کے کفن و دفن میں مشغول رہے اور جب سورج نکل آیا تو تعاقب میں نکلے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس ارشاد میں کہ "فاتبعوھم مشرقین" (سورج نکلنے پر انھوں نے ان کا پیچھا کیا) موسیٰ علیہ السلام قوم کے پیچھے چل رہے تھے اور ہارون علیہ السلام آگے تھے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انھیں مذکورہ روایات کی طرح منقول ہے "وانتم تنظرون" (اور یہ سب کچھ آپ دیکھ رہے تھے) یعنی تم دیکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح تمہارے لئے سمندر میں راستے بنائے اور جس راستے پر سے گذر کر تم نے نجات پائی، اسی پر فرعون ہلاک ہوا۔ تم نے اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و غلبہ کا بھی مشاہدہ کیا کہ کس طرح ٹھاٹھیں لیتا ہوا سمندر بلند اور اٹھے ہوئے تودوں کی طرح بن گیا اور جو کچھ اللہ کا حکم تھا اس سے سر مو جنبش نہیں کی۔ یہ تمام انعامات اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل پر کئے تھے۔ لیکن اس موقعہ پر ان کے ذکر سے مقصد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو متنبہ کرنا ہے کہ آج وہ خود اپنے دشمن فرعون کے کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور اس سرکشی اور کفر کے نتیجہ میں ان پر بھی وہی عذاب آسکتا ہے جو فرعون پر آیا تھا۔

تفسیر ابن جریر کا جزء ۱ تمام ہوا۔

جزء دوم کا انتظار فرمائیے